عُمدۃُ المجالِس

سیدّ کلب حسین رح

مکتبۂ ایمان جوہری محلہ لکھنؤ ۔ ۳

پیش لفظ

والد ماجد کے مسودات کا ایک اور مجموعہ عمدۃ المجالس پیش خدمت ہے۔

سرکار مرحوم کے مسودات عام طور سے کافی طویل ہوتے ہیں یعنی موجودہ سائز میں ہر مسودہ کم از کم ساٹھ ستر صفحات تک اوسطاً پھیل جائے گا۔ ان مسودات کو چھوٹا کرنے میں بسا اوقات دقت درپیش ہو جاتی تھی اس لیے ربط برقرار رکھنے کے لیے خود بھی کہیں کہیں اپنی عبارت شامل کرنا پڑی ہے۔

پھر یہ کہ والد ماجدؒ نے ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر مصائب کبھی نہیں تحریر فرمائے بلکہ صرف ربط دے کر مسودہ ختم فرما دیا کرتے تھے اس لیے مصائب کا اضافہ بھی مجھ ہی کو کرنا پڑا ہے۔ ان سات مسودات کی ترتیب اور تلخیص ماہ شعبان ۱۳۸۲ھ ہی میں ہو چکی تھی۔ "دس" کی تعداد پوری کرنے کے لیے صرف ۳ ہی مسودات کی ترتیب و تلخیص باقی تھی کہ اسی زمانے سے والد ماجد کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی انتہا سایۂ پدری سے محروم ہو جانے پر ہوئی۔ ان پریشانیوں میں کتاب کی تکمیل کا سوال ہی کیا تھا؟

گذشتہ تین چار ماہ سے محترمی انصار حسین صاحب منیجر سرفراز کا مسلسل اصرار تھا کہ محرم ۱۳۸۴ھ تک کتاب ضرور شائع ہو جائے مگر مصروفیت کچھ ایسی رہی کہ کام آگے بڑھ ہی نہ سکا۔ مجبوراً سات ہی مسودات پر اکتفا کرنا پڑی۔ اور اب ان ہی مسودات میں مصائب کا اضافہ کر کے کوشش ہے کہ کتاب

جلد از جلد آپ کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

خیال ہے کہ سات سات مسودات کے دو مجموعے شائع کرکے چودہ کی مبارک تعداد پوری کردی جائے۔ دوسرا حصہ بھی انشاءاللہ جلد ہی شائع ہوجائیگا۔

جیسا کہ میں عرض کرچکا مسودات کی تلخیص اور مصائب کا اضافہ بہت عجلت میں ہوا ہے۔ پھر مجھے اپنی جہالت اور بے سوادی کا احساس ہے۔ خدا کرے کہ کوئی ایسی بات نہ درج ہوگئی ہو جو کسی لحاظ سے نامناسب ہو یا کسی کو شکوہ و شکایت کا موقع ملے۔

آخر میں ایک چیز اور عرض کردوں۔ والد ماجدؒ کے مسودات زیادہ تر سنجیدہ اور ٹھوس علمی مضامین پر مشتمل ہیں۔ مگر ذوق عوام نے مجبور کردیا ہے کہ صرف ہلکے پھلکے مسودات ہی پر اکتفا کی جائے۔ دل چاہتا ہے کہ اُن کے وہ علمی شاہکار بھی منظرِ عام پہ آجائیں۔ خدا کرے کہ یہ تمنائے دل پوری ہوجائے۔

میں محترمی انصار حسین صاحب کا شکر گزار ہوں جن کے مسلسل اصرار اور یاددہانیوں کی بنا پر کتاب کی تکمیل ہوسکی۔ نیز جناب ایم ایم غلام حسین صاحب مینیجر مکتبۂ ایمان کا بھی شکر گزار ہوں جن کے تعاون سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے۔

والسلام

۳۰؍ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ

سیّد کلب صادق

مجلسِ اوّل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کَمَا ھُوَ اَھْلُہٗ وَالشُّکْرُ لَہٗ اَتَمَّہٗ وَاَکْمَلَہٗ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَصَفْوَۃِ بَرِیَّتِہٖ خَلِیْفَتِہٖ وَحَبِیْبِہٖ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی الْمَحْمُوْدِ فِی الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ وَاَھْلِبَیْتِہٖ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ مِنْ یَّوْمِنَا ھٰذَا اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ، وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّصِھْرًا وَکَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا۔

خلاقِ عالم ارشاد فرماتا ہے اپنی تعریف کرتے ہوئے کہ "خدا وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو بنایا اور داماد بھی کیا، قرابتِ خاندانی بھی دی اور سسرالی رشتہ بھی دیا، نسب بھی عطا کیا اور سبب بھی دیا۔" یہ ہے وہ مختصر آیت جسے مختصر مطالب کے ساتھ اس مجلس میں مجھے عرض کرنا ہے۔

یوں تو ہر منھ میں زبان ہے اور ہر زبان میں قوتِ گویائی، کہہ دینا آسان ہے کہ

فلاں شئے ہم نے بنائی لیکن ہم گیا اور ہماری ہستی گیا جو خلق کرسکیں ۔ کسی شئے کی صورت بدل دینا ہمارے اختیار میں ہے مگر خلقت و ایجاد کچھ اور ہی ہے ۔ نہ ہم نے آج تک کچھ خلق کیا نہ ہم نے آج تک کچھ ایجاد کیا ۔ تمام قوت کا زور ختم ہے صرف اس میں کہ صورت بدل دی ۔ لکڑی کا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں ہے ؟ ہرگز نہیں ۔ ہاں اِسے تراش کر تخت بنا لینا یہ ہماری صنعت ہے ۔ لوہے کا بنا لینا ہماری قوت میں ہے ؟ کبھی نہیں ۔ اُس کی شکلیں بنا دینا ہمارا زور ہے ۔ ہر جسم میں دو چیزیں لازمی ہیں ایک مادہّ دوسرے صورت ۔ مادہ ہمارے قبضے سے باہر ہے، نہ اُسے ہم خلق کرسکتے ہیں نہ ہم اُسے مٹا سکتے ہیں ۔ وہ باقی رہے گا اور بہر حال باقی رہے گا ۔ البتہ صورت وہ ہمارے اختیار میں ہے ۔ اگر ہاتھ میں زور ہے تو جو صورت چاہے پیدا کر دیجیے ۔ اگر مادہ نرم ہے تو انگلیوں کی حرکت کافی ہوگی، اگر مادہّ سخت ہے تو اوزار کا محتاج ہے ۔ جیسے موم کہ نرم ہے اور اس حد کا فقط ہاتھ کی مدد سے جو صورت چاہیے بنا لیجیے ۔ اور جیسے لوہا کہ سخت ہے اور اس حد کا کہ انگلیوں کا زور بے کار ہے ۔ اُس سے کوئی صورت بنانے میں اوزار کی ضرورت ہے، چاہے باریک سے باریک پرزہ ہو وہ بھی بن جائے گا اور بڑی سے بڑی مشین ہو وہ بھی تیار ہو جائے گی ۔ لیکن اگر آپ بغیر آلے کے محض انگلیوں سے کام لینا چاہیں تو زورِ نبوت مانگنا ہوگا ۔ موم انگلیوں کی اطاعت کرے گا لیکن لوہا قوت داؤدی کا محتاج ہے ۔ اوزار کے ذریعے سے زرہ بنا لیجیے مگر ہاتھ کی قوت سے زرہ بنانا اعجاز کے بغیر ناممکن ہے ۔ یہ ہمارے ہاتھ ہیں کہ لوہا انگلیوں میں نرم ہونا ناممکن ہے اور وہ حدِ اعجاز تھی کہ فولاد موم ہو جائے ۔

مادےّ کا تبدیل کرنا محال مگر صورت کا بدل دینا سہل ۔ لیکن پھر بھی خدا نے

قدرت نمائی کی کوئی حد باقی نہ رکھی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر کوئی شے نرم ہے جیسے موم تو اُس کی صورت بدل دینا ہمارے اختیار میں ہے۔ مگر یہ نہ سمجھیے جو نرم ہے وہ اپنے قبضے میں ہے بلکہ خدا نے اپنا اختیار یوں بھی دکھایا ہے کہ جس طرح سخت سے سخت آپ کی قدرت سے باہر، یوں ہی نرم سے نرم وہ بھی آپ کے قبضے سے الگ۔ یہ معلوم ہے کہ پانی سے بڑھ کے کوئی نرم شے کم ہے۔ جس قدر اس کا جسم لطیف ہے اُس قدر اور اجسام نہیں ہیں۔ جس قدر وہ بہ ظاہر نرم ہے اُس قدر ہوا کے علاوہ اور کوئی شے نرم نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ پانی باقی رہے اور اس کی صورت بدل دیں تو ناممکن ہے۔ مجبور کر کے جس شکل میں چاہے بدل دیجیے مگر ادھر وہ مجبوری ہٹی اُدھر وہ اپنی اصلی شکل پر آیا۔

ابھی شکل بدلنا دوسری شے، بھلا کوئی نقش ہی بنا دیجیے۔ پتھر سا سخت جسم آپ کی بنائی ہوئی تصویر بن جائے گا، لوہا آپ کا دیا ہوا نقش مان لے گا مگر پانی نہ اس پر لکیر کھنچ سکتی ہے نہ اُس پر کوئی نقش جم سکتا ہے، نہ اس سے صورت بن سکتی ہے۔ کچھ نہیں۔ ادھر نقش بنایا اُدھر غائب، ادھر لکیر کھینچی اُدھر ناپید۔ نقش بر آب ضرب المثل ہے۔

لیکن خدا کی قدرت ہے کہ وہ پانی جس پر ہمارے بنائے کوئی نقش بنتا نہیں اُسی کے مختصر صفحے پر انسان کا نقش اُبھار کے چھوڑا، اور پھر تنگ مقام اور تاریک جگہ، اور اس میں نقشِ ہستی اور پانی کا ورق، اور خطوط کی کشش اور نقطوں کا محل سے پڑنا، اور قلمِ قدرت کی روانی۔ مشکل تھا کام اتنا کہ جہاں پر صناع عاجز اور ہر نقاش بے کار۔ نہ باپ کو خبر کہ کیونکر بنایا، نہ ماں کو حس کہ کب بنایا، نہ دیکھنے والوں کو علم کہ کیا بنایا، اور اشارۂ قدرت اپنے کام میں۔ اسی پانی میں نقش بنا اور اسی پانی میں

رگوں کا جال بچھایا اور اسی جال میں جسم انسانی کی بندش دی اور اسی بندش کے اندر گوشت الگ بنایا، استخواں الگ بنائے، خون الگ بنایا۔ ہاتھ اپنے مقام پر، پیر اپنی جگہ پر، دل اپنے محل پر، دماغ اپنی منزل پر، اور پھر مدت بھی کچھ نہیں نو مہینے! اگر کام آسان ہوتا تو مدت کم ہوتی۔ مگر سخت تھی صنعت اور اتنی کہ نو مہینے بھی کم تھے، مگر اس کے واسطے نہیں جس نے خلق کیا بلکہ ہمارے واسطے جن کی تمام قدرت اس محل پر بے کار، اور تمام علم اس صنعت میں کم زور۔ اگر ہم بنائیں تو تمام عمر کی وسیع مدت وہ بھی کم، عمر نوح وہ بھی ختم قبل اس کے کہ صنعت تمام ہو۔ لیکن وہ جس نے بنایا اس کے واسطے نو مہینے بھی زائد۔ اگر چاہے نو دن میں بنائے، اور اگر چاہے تو نو گھنٹے کافی، اور ارادہ کرے تو چشم زدن بھی بہت۔ میرا محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ ثبوت ساتھ ساتھ ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو یوں بھی دیکھیں کہ ایک سال میں بنایا جیسے بہت سے جانور، اور اگر دیکھنا چاہیں تو یوں دیکھیں کہ نو ماہ میں بنایا جیسے تمام انسان، اور اگر چاہیں تو یوں دیکھیں کہ چھ مہینے میں خلق کیا جیسے حضرت یحییٰؑ اور اس کے بعد حسینؑ ابن علیؑ۔ اور اس سے بھی کم مدت میں زور صنعت دیکھنا چاہیں تو حضرت عیسیٰؑ پر ایک حقیقت شناس نظر، کہ بنا بر ایک روایت کے کل نو گھنٹے شکم مادر میں رہے۔ اور اگر قدرت معلوم کرنے کی ضد ہو تو حضرت حجۃؑ پر ایک نگاہ، کہ ادھر ماں کی نگاہ جھپکی ادھر بچہ آغوش مادر میں۔

بہر حال یہ تو اس بنا پر تھا کہ جب تفسیر آیت یوں کی جائے کہ بشر سے مراد جنس بشر یعنی ہر انسان اس کو خدا نے پانی سے خلق کیا۔ لیکن اگر تفسیر اجازت دے تو میں کہوں گا یہ کوئی اور ہی انسان تھا۔ یہ مسلّم کہ ہر انسان کی خلقت پانی سے ہوئی مگر آیت ہر انسان کا

ذکر نہیں کرتی بلکہ وہ کوئی خاص انسان تھا جس کی خلقت بیان کر کے آیت کہہ رہی ہے کہ اس میں نسب کا رشتہ بھی تھا اور سسرالی قرابت بھی تھی۔ جیسے ایک ہی درخت کی دو شاخیں جو ایک جگہ سے الگ ہوئیں اور آگے بڑھ کے پھر مل گئیں۔ یا ایک ہی دریا کی دو نہریں جو کٹ کے جدا بھی ہوئیں اور پھر دونوں کا سنگم ایک ہو گیا، جیسے ایک ہی نور کے دو ٹکڑے جو انگلی کے اشارے سے الگ بھی ہوئے اور تھوڑی دیر میں پھر جڑ گئے، بلکہ جیسے کعبے کی دیوار جو راستہ دینے کو شق بھی ہوئی اور چھپا لینے کو جڑ بھی گئی وہ، وہ بشر تھا جو بھائی بھی تھا اور داماد بھی تھا، قوت بازو بھی تھا، وصی بھی تھا، پروردہ آغوش بھی تھا، مددگار بھی تھا، اہل بھی تھا، صحابی بھی تھا۔

آپ کہیں گے کہ پھر ایسے تو دنیا میں بہت ہوں گے جو ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، دونوں طرح، یعنی نسب بھی ہو اور سبب بھی ہو۔ جیسے کوئی کسی کا بھتیجا بھی ہو، داماد بھی ہو، بھانجا بھی ہو اور داماد بھی ہو، بچا بھی ہو خسر بھی ہو۔ تو میں عرض کروں گا کہ ہاں، مگر ہر رشتہ قابلِ فخر نہیں ہوتا اور ہر پیوند قابلِ تذکرہ نہیں ہوتا۔ معمولی لوگ اُن کے رشتے نہ مقام شرف میں ذکر کے لائق، نہ مجلسِ فخر میں تذکرے کے قابل۔ البتہ جو رشتہ بڑے سے ہو وہ ذکر کیا جاتا ہے اور ہر محل پر۔ یعنی اپنا شرف وہ بھی قابلِ ذکر اور جس سے رشتہ ہو اگر وہ بزرگ منزلت ہو تو وہ رشتہ بھی قابلِ فخر، جیسے بادشاہ کا لڑکا یہ شرف ہے، جیسے امام کی اولاد یہ فخر ہے، جیسے عالم سے نسب یہ منزلت ہے۔ اور یہی منزلتیں قابلِ فخر ہیں۔ آج تک لقب مشہور ہے میر باقر داماد۔ میں پوچھوں کہ شہرت کی دیکھیے کیا ہے، کیا ان کے علاوہ کوئی اور کسی کا داماد نہ تھا، ہرگز نہیں، مگر تھے بادشاہ کے داماد، تو شرف تھا۔

ابھی جب خسر ہونا لوگ شرف جانتے ہیں اور اتنا بڑا شرف کہ عرض کر گیے بیٹی دینے پر تیار، سفارشیں اٹھا کے رشتہ جوڑنے کو موجود۔ تو جناب جب خسر ہونا کوئی منزلت ہے تو داماد ہونا اس سے بڑھ کے ہے۔ اور جب بیٹی دینا سبب فخر ہے تو بیٹی پانا اس سے بڑھ کے ہے۔ یہ میں ایک عام بات کہہ رہا ہوں۔ نہ اس میں کوئی تلمیح مقصود تھی اور نہ اشارہ۔ بلکہ عرض کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ چھوٹوں سے رشتہ مل جانا نہ قابلِ فخر ہے نہ موجب شرف، البتہ اگر رشتہ ملے اور بڑے سے ملے تو وہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔ تو معلوم ہوا کہ خدا نے بھی کسی معمولی شخص کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ آیت میں تذکرہ ہے اُس بشر کا جس کی خلقت وہ بھی قابلِ ناز، جس کی ولادت وہ بھی ممتاز، جس کے رشتہ دامادی بھی قابلِ فخر، اور جس کی سسرال وہ بھی باعث منزلت۔

صانع نے بنایا تو خود بھی ناز کیا کہ بے نظیر بنایا هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا "خدا وہ ہے جس نے پانی سے ایک بشر بنایا" اور بے مثل بنایا، انبیاء سے بہتر بنایا اس لیے ناز کیا، ملائکہ سے افضل تر بنایا اس لیے ذکر کیا، بلکہ تمام عالم سے افضل بنایا سوائے ایک کے اس لیے فخر کیا۔

آپ سمجھے؟ وہ بشر کون ہے جس کا ذکر ہے، وہ انسان کون ہے جس کا تذکرہ ہے۔ کوئی اور نہیں بلکہ وہ جس کی طرف دل جھک جاتے ہیں، نگاہیں ڈھونڈھ رہی ہیں، یعنی امام المتقین، سید الوصیین، یعسوب الدین، امیر المومنین، غالب کل غالب علی ابن ابی طالبؑ۔ یہ شرف تھا علیؑ کے واسطے کہ اگر نسب میں دیکھیے تو وہ خاندان جس سے بہتر ممکن نہیں۔ تمام مخلوقاتِ عالم سے عرب بہتر، اور تمام عرب سے قریش بہتر، اور تمام قریش سے بنی ہاشم افضل، اور تمام بنی ہاشم سے سردارانِ بنی ہاشم بہتر اور تمام سرداروں

سے حضرت عبداللہ اور ابوطالب بہتر، کہ عبداللہ کے صلب سے رسول پیدا ہوئے اور ابوطالب کی آغوش میں رسولؐ نے تربیت پائی۔

لوگ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ ابوطالب کافر تھے۔ خیر یہ جھگڑا اور ہے مگر تھے کچھ ایسے کہ جن کی آغوش میں رسولؐ پلا، اور جن کے صلب سے وہ بشر پیدا ہوا جس پر خود خالق کو ناز ہے اور جن کے مر جانے کے بعد رسولؐ کو وحی ہوئی کہ اب تمہارا مکے میں کوئی مددگار نہیں ہے لہٰذا ہجرت کرو، یعنی خدا نے جس کی حمایت میں اپنے رسولؐ کو دے دیا تھا وہ ابوطالب تھے۔ ابھی معاذ اللہ اُسے کافر کون کہے جس کے بچے کا ولادت کدہ خانہ کعبہ بنے۔ کیا وہ بچہ جو کعبے میں پیدا ہوا علیؑ کے سوا کوئی اور تھا، یعنی وہ بھی شرف تھا کہ کس خاندان میں پیدا ہوئے، اور یہ بھی شرف کہ کس جگہ پیدا ہوئے۔ وہ گھرانا تھا جس میں نسب ملا اور یہ گھر تھا جس میں پیدا ہوئے، یعنی گھرانا رسولؐ کا اور گھر خدا کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ کعبے میں پیدا ہونا علیؑ کے واسطے شرف نہ تھا بلکہ کعبے کو شرف ہو گیا کہ زچہ خانہ بنا۔ مگر جناب میں اسے نہیں مانتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں، کعبہ اگر کوئی اور مکان ہوتا تو بے شک فضیلت کچھ نہ تھی، لیکن اگر خانۂ خدا ہونا کوئی منزلت تھی تو بے شک شرف تھا اور علیؑ کے واسطے بھی اسی طرح، جس طرح خود کعبے کے واسطے کیوں کہ کعبہ عبادت کدہ تھا مگر مسجودِ خلق نہ تھا، لیکن علیؑ نے پیدا ہو کے اس قابل کر دیا کہ پیشانیاں خم ہو جائیں۔ یوں ہی اپنے بندے کو اپنے گھر میں پیدا کرنا یہ شرف تھا، اور علیؑ کے واسطے، جس طرح کعبہ ناز کر سکتا ہے اور یوں کہ علیؑ سا بندہ مجھ میں پیدا ہوا، اسی طرح ہم ناز کر سکتے ہیں کہ علیؑ وہ ہیں جن کے واسطے خدا کو بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے سوا کسی اور کے گھر میں پیدا

ہوں۔ نسب وہ جو عرض کر چکا کہ بہتر سے بہتر، اور جائے ولادت وہ جو تمام دُنیا سے افضل تر، کیوں کہ تمام عالم کی زمینوں سے بہتر "مکّہ"، اور تمام مکّے میں وہ حصّہ بہتر جو حرم، اور تمام حرم سے وہ زمین بہتر جس میں مسجد، اور تمام مسجد میں وہ جگہ بہتر جس میں کعبہ، اور تمام کعبے سے وہ جگہ بہتر جو علیؑ کی جائے ولادت۔ کیوں کہ مسلّم ہے کہ داہنا حصّہ بائیں سے افضل ہوتا ہے اور علیؑ کی ولادت کعبے میں اُس گوشے میں ہوئی جو داہنا تھا، اور بھئی! اصحابِ یمین کا امام تھا۔ مناسب بھی تھا کہ داہنی ہی طرف پیدا ہو۔

کیا کہنا اس فضیلت کا کہ بچّہ طاہر، نسل طاہر، یہاں تک کہ وہ جگہ بھی طاہر جہاں پیدا ہوے۔ پہلے ایسا پاک کوئی مِل لے جب آیۂ تطہیر خبر دے کہ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ گویا قدرت کو ضد تھی کہ کوئی فضیلت اُٹھ نہ رہے۔ سجا اور ہر پہلو سے سجا، آراستہ کیا اور ہر رُخ سے آراستہ کیا۔ یہ بھی طہارت کہ اپنے گھر میں پیدا کیا، اور یہ بھی حُرمت و عزّت کہ دنوں میں وہ دن معین کیا جو یومِ محترم یعنی جمعہ، مہینوں میں وہ مہینہ لیا جو شہر الحرام یعنی رجب، زمینوں میں وہ زمین جو مسجد الحرام، اور مقام میں وہ مقام پسند کیا جو بیت الحرام۔ تو پھر مولود کی حُرمت خدا ہی جانے۔

لوگ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ ماں باپ کافر تھے۔ تو میں پوچھوں کہ کافر ماں باپ کا بچّہ کافر تھا یا مسلمان؟ یعنی ماں باپ معاذ اللہ تھے کافر تو بچّہ جو حکمِ مذہب میں ماں باپ کا تابع ہوتا ہے وہ کافر تھا یا مسلم؟ اب یا تو کہیے کہ ماں باپ مسلمان اور یا کہیے نہیں، معاذ اللہ بچّہ بھی کافر، اور جب کافر تو کہنا پڑے گا کہ نجس، اور جب نجس تو میں پوچھوں گا، اُدھر تو ابراہیم و اسمٰعیل کو حکم طَھِّرَا بَیْتِیَ "میرا مکان پاک

گرددٗ" اور خود یہ عمل کہ نجاست کعبے میں پہنچادی۔؟

سُنا آپ نے! اگر کعبے کا در کھلا ہوتا اور فاطمہ بنتِ اسد داخل ہوجائیں تو کہنے والے کہہ دیتے کہ جس طرح اور کافر جاتے تھے اور خدا نے نہ روکا، بلکہ حد یہ ہے کہ بتوں نے قبضہ کیا اور خدا مانع نہ ہوا، یوں ہی فاطمہ بنتِ اسد بھی گئیں اور علیؑ کی ولادت ہوگئی۔ مگر اپنی مصلحت وہی خوب جانتا ہے جو کوئی کام کرتا ہے۔ خدا بھی اگر دروازے سے بلاتا تو اعتراض کے دروازے کھل جاتے، مگر در کو مقفل رکھا اور دیوار میں در بنایا تاکہ دیکھنے والے سمجھ لیں کہ وہ آنے والے اور تھے اور یہ آنے والا اور تھا۔ ان کا راستہ وہ تھا جو انسان نے بنایا اور اس کا راستہ وہ تھا جو خدا نے بنایا۔ نہ مجھے معلوم کہ کعبہ کسی اور نے نہیں بنایا تھا بلکہ خلیل کی تعمیر تھی، مگر وہ در انھیں مبارک جو رسولؐ کے راستے پر چلیں، مگر جسے خدا اپنے راستے پر چلانا چاہے اس کے واسطے لازم تھا کہ ید قدرت سے در بنائے۔

ادھر فاطمہ بنت اسد قریب کعبہ آئیں اور اُدھر گلِ امامت کی بُو پاکے کعبے کی دیوار کھلی۔ خدا ہی جانے دلِ کعبہ میں کون سا زخم تھا کہ ماہِ امامت کی چھوٹ پڑتے ہی زخم نے منھ کھول دیا۔ یہ تھا وہ در جو علیؑ کے واسطے ید قدرت نے بنایا۔ فقط یہ دکھانے کو کہ اور آئیں تو آئیں مگر یوں جیسے ناخواندہ مہمان، اور علیؑ آئیں تو یوں آئیں کہ ہر دیکھنے والا سمجھ لے کہ ہم نے بلایا۔ ادھر فاطمہ بنت اسد داخل ہوئیں اُدھر دیوارِ کعبہ پھر مل گئی اور یوں مل گئی جیسے موتی کو سینے میں جگہ دے کے صدف کا منھ بند ہوجائے۔ اور جناب دیکھنے کے قابل تھی یہ بات کہ دروازہ تھا کعبے کا اُس رُخ کہ جس کے اوپر بُت جمے تھے تو خدا کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ اُس در سے علیؑ ہو کے نکلیں، کیونکہ

اگر نکلتے تو بتوں کا سایہ ضرور پڑتا، اور اب تو بات کہنے کو رہ گئی کہ بتوں کو سجدہ کیسا سایہ بھی نہ پڑا۔

بہرحال کعبے کی دیوار جُڑی اور علیؑ کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی اور تین دن تک فاطمہ بنت اسد مہمان رہیں۔ قریش کو فکر ہوئی کہ کعبے کا در کھول کے دیکھیں کہ فاطمہ پہ کیا گزری۔ مگر وہ دن اور تھے جب دروازہ کھل جاتا تھا، آج کا دن اور تھا، جب تمام زور ختم ہو گئے اور قفل در کھل نہ سکا۔ گویا خدا نے دکھا دیا کہ آج وہ عام دعوت نہیں ہے کہ ہر شخص چلا آئے، بلکہ صرف وہی آسکتا ہے جسے خدا بلائے۔ جب تین دن ختم ہوئے تو ندا آئی کہ فاطمہ اب جاؤ ہمارا حبیبؐ علیؑ کا مشتاق ہے۔ اِدھر فاطمہ بچے کو لے کے نکلیں اُدھر دیوار نے جگہ دی، اور اسد کی بیٹی خدا کے گھر سے شیر سا بچہ لے کے نکلی۔ کیا کہنا اُس بلند منزلت کا جس کی ابتدائی منزل خدا کا گھر، یعنی فرق ہے ہم میں اور علیؑ میں اور بہت فرق۔ ہماری انتہائی منزل یہ ہے کہ حج کعبہ کریں، اور علیؑ کی ابتدائی منزل یہ تھی کہ کعبے میں پیدا ہوں۔ پھر جس کی ابتدا وہ تھی جو ہماری انتہا، تو انتہا کی منزلت خدا ہی جانے۔ اِدھر سے فاطمہ جا رہی ہیں اور اُدھر سے رسولؐ آ رہے ہیں۔ اِدھر علیؑ پہ نظر پڑی اُدھر بڑھ کے لیا اور اِدھر علیؑ آغوشِ رسولؐ میں آئے اور اُدھر آنکھ کھول کے جمالِ رسولؐ دیکھا۔ یعنی جب تک آنکھیں بند تھیں مشاہدۂ جلالِ خدا تھا اور جب آنکھیں کھول دیں تو زیارتِ جمالِ رسولؐ تھی اور اِدھر سورۂ محمدؐ پر نگاہ پڑی اُدھر کتابِ خدا شروع کر دی۔ یعنی ایک نہیں ہر کتاب سنائی اور اس طرح سنائی کہ رسولؐ بول اُٹھے کہ انبیائے سابق سے بہتر یاد ہے۔

اور جناب اتنا علم زبردست کیوں کر نہ ہوتا کیوں کہ مکتبِ قدرت سے سند لے

مکے بھیجے تھے۔ کعبے سے نکلنا اور رسولؐ کے ہاتھوں پر آتے ہی پڑھنا اس کا ثبوت تھا کہ تین دن مہمانی بے سبب نہ تھی، رد کا تھا اس لیے کہ سب پڑھادے اور رُکے اِس لیے کہ سب پڑھ لیں۔ پڑھانے والا بے نظیر تھا کہ تین ہی دن میں تعلیم ختم کر دی، اور پڑھنے والا بے مثل تھا کہ اتنی ہی مدت میں سب یاد کر لیا۔ یہ شرف تھا اور مخصوص علیؑ کے واسطے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ جب ایسے فضائل جمع تھے تب خدا نے ناز کیا ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا "وہ خدا وہ ہے جس نے پانی سے ایسا بشر بنایا" یہ وہ پانی نہیں جس سے ہر انسان کی خلقت ہوئی بلکہ وہ پانی جس کے واسطے رسولؐ نے فرمایا "خدا نے عرش کے نیچے ایک پانی خلق کیا آدمؑ کی خلقت سے تین ہزار برس پہلے، اور اُسے ایک سبز موتی میں جگہ دی، یہاں تک کہ جب آدمؑ کی خلقت کا وقت آیا تو اُس پانی کو اُن کے صلب میں جگہ دی اور یوں ہی وہ پانی منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ نصف صُلبِ عبداللہ میں آیا اور نصف صُلبِ ابوطالبؑ میں آیا۔ ایک سے میری خلقت ہوئی اور دوسرے سے علیؑ پیدا ہوئے"۔

قرآن میں آیت بھی اور اب بھی ہے کہ وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ یعنی "جب کچھ نہ تھا تو خدا کا عرش پانی کے اوپر تھا" اور رسولؐ فرماتے ہیں کہ علیؑ کی خلقت اُس پانی سے ہوئی جو عرش کے نیچے تھا۔ میں تفسیر آیت نہیں کرتا مگر صرف پوچھتا ہوں اپنے رسولؐ سے کہ یا رسول اللہ! وہ پانی کون تھا جو عرش کا بوجھ روک سکا، یہی پانی جس کی خبر آپ نے دی یا کوئی اور؟ بہر حال وہ جو کچھ بھی ہو مگر روایت آیت سے مل گئی۔ طریقہ تو یہ تھا کہ پانی کے اندر موتی پرورش پائے مگر یہ پانی وہ تھا جس نے موتیوں میں پرورش پائی۔ اور موتی بھی وہ جس نے صدف کا

مُنھ نہ دیکھا۔ اب آپ سمجھے کہ موتی میں آب کیوں ہے۔ "جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد"۔ نہ سینے میں اس پانی کو جگہ دیتا جس سے علیؑ و نبیؐ خلق ہوئے اور نہ موتی میں آب آتی، مگر دل میں رکھ لیا تھا تو آبرو یہ پائی کہ آج تک موتی میں آب باقی ہے۔ خدا سے بڑھ کے عادل کوئی ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا جیسی گہر نے عبادت کی تھی ویسی ہی اُس نے جزا پائی۔ اوّل خلقت میں پانی کو سینے میں رکھ کے پالا تو خدا نے موتی کا محلِ تربیت پانی بنایا، اور اگر اُس نے اس پانی کی حفاظت کی جس سے وہ بحر بنے جس کی تعمیر میں خدا نے آیت اُتاری مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ ایک سے مراد بحرِ امامت اور دوسرے سے مراد بحرِ نبوت تو خدا نے موتی کی جگہ بحرین میں کی جہاں سے آج تک موتی نکلتے ہیں۔

رسولؐ فرماتے ہیں کہ میں اور علیؑ اس وجہ سے بھائی ہیں کہ ایک ہی پانی سے دو بنے۔ یہ تھا نسب جس کا خدا نے ذکر کیا۔ اور اس مقام پر جہاں اپنی نشانیاں گنوا رہا تھا اور یہ تھا سبب کہ بھائی کو رسولؐ کا داماد کیا۔

دُنیا میں دو ہی طرح کے رشتے ہوتے ہیں ایک سببی اور ایک نسبی۔ نسبی رشتہ وہ جس میں کہیں نہ کہیں اصل ایک ہو جائے اور سببی رشتہ وہ جو عقد کے ذریعہ ہو۔ اور یہ معلوم ہے کہ نسبی رشتہ قوی ہوتا ہے اور سببی رشتہ ضعیف ہوتا ہے۔ کیوں کہ نسبی سلسلہ وہ ہے جس میں بجز قدرت کے سوا دوسرے کا زور بے کار ہے، اور سببی رشتہ وہ جس میں انسان کا اختیار جاری ہی کیا ہے کسی انسان میں یہ قوت کہ جو اپنا لڑکا نہ ہو اُسے اولاد بنا لے، جو بھائی نہ ہو اُسے اخوت دے، جو باپ ہو اُس سے اُبوت کا رشتہ جوڑ دے؟ ہرگز نہیں۔

تو معلوم ہوا کہ نسب ایسا قوی رشتہ ہے کہ جس کا ملانا سوائے خدا کے کسی کے اختیار میں نہیں لیکن سبب یعنی نکاح کا رشتہ وہ سب کے اختیار میں ہے کہ جس سے آپ عقد کر لیں وہ آپ کی زوجہ

دُنیا کے نزدیک بھی اور خدا کے نزدیک بھی۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہ رشتہ اتنا کم زور ہے کہ ہر ہاتھ گرہ لگا سکتا ہے۔ تو اب نسب ہوا قوی اور سبب ہوا ضعیف۔ لہذا جہاں نسب سبب سے ٹکرائے وہاں سمجھ لیجیے کہ غالب کون، سبب یا نسب؟ ہر شخص بول اُٹھے گا کہ وہی غالب جو قوی۔ تو ہو گیا فیصلہ کہ حق پہ کون تھا۔

بہر حال دُنیا میں رشتے دو، اور خدا نے دونوں رشتے علیؑ میں جمع کر دیے۔ نسب بھی دیا اور سبب بھی دیا، بھائی بھی بنایا اور داماد بھی۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ دونوں رشتے برابر کے قوی اور دونوں گرہیں تلی ہوئی۔ آپ فرمائیں گے یہ کیونکر؟ کیوں کہ تم نے ابھی کہا کہ سبب کا رشتہ نسب سے کم زور ہوتا ہے، اور اب یہ کہتے ہو کہ علیؑ کے رشتے دونوں برابر تو میں عرض کروں گا کہ ہاں، میں نے کہا اور ضرور کہا۔ اور میں اسے بتاؤں گا کہ اوروں میں سبب کم زور اور نسب قوی، مگر علیؑ کے واسطے دونوں رشتے بالکل برابر۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہاتھ کا ضعف گرہ کی کم زوری کی دلیل ہے۔ انسان نے جو رشتہ خود جوڑا وہ اُس کی کم زوری کا اثر لے کے رہا اور خدا نے اپنے یدِ قدرت سے جو سلسلہ ملایا اُس میں اُس کا زور، اثر دیتا رہا۔ اِس لیے نسب قوی اور سبب ضعیف لیکن یہ فرق وہاں نکلنا سہل جہاں رشتہ ملانے والے بدل جائیں، لیکن جہاں دونوں سلسلے ایک ہی ہاتھ کی بندش ہوں وہاں یہ فرق محال ہے۔ اور علیؑ کے واسطے ایسا ہی تھا کہ جس حکم نے نسب ملایا اُسی حکم نے سبب جوڑا۔ اگر علیؑ کا نکاح عرش کے اوپر نہ ہوتا تو فرق نکل آتا۔ مگر جب معلوم ہے کہ خدا ہی نے قرابت نسبی بھی دی اور خدا ہی نے عقدِ نکاح بھی پڑھا تو سبب بھی نسب برابر رہا۔

اگر آیت سے ثبوت طلب کیجیے تو یہی آیت ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ

بَشَرًا " خدا وہ ہے جس نے علیؑ سا بشر پانی سے بنایا" وَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّصِھْرًا
"اور خدا ہی نے علیؑ کو رسولؐ کا رشتہ دار بھی بنایا اور داماد بھی بنایا"۔ اب تو مانیے گا
کہ جس نے بھائی بنایا اُسی نے داماد بنایا۔ اور اگر روایت دیکھیے تو اُس وقت پر نظر،
جب لوگوں نے سیدہؑ کی آرزو کی اور رسولؐ نے سب کو جواب دیا۔ اجی کون کون خواہش مند
نہیں تھا؟ کس نے کس نے التجا نہیں کی، مگر جو آیا اُسے جواب۔ سب سے پہلے، پہلے آئے۔
"یا رسول اللہؐ! سیدہؑ کا عقد مجھ سے کیجیے"۔ فرمایا۔ "میں نہیں جانتا خدا کو اختیار ہے"۔
آ کے اپنے رفیق سے کہا کہ یہ جواب ملا۔ انھوں نے کہا تو "بس صاف ہے جواب"۔ کہا
"اچھا تم جاؤ"۔ دفعۂ ثانی بھی وہی جواب۔ یہ بھی پلٹے۔ مختصر یہ کہ بہت سے آئے
مگر سب ناکام، اور یہی جواب کہ وحی کا انتظار ہے۔ یہاں تک کہ سب نے رائے کی کہ
رسولؐ کسی کے ساتھ سیدہؑ کا عقد نہیں کرتے، اس کی وجہ کیا ہے؟ بعض نے کہا کچھ
نہیں، ہمارا خیال ہے کہ رسولؐ اگر کریں گے تو علیؑ کے ساتھ، مگر علیؑ نے پیغام نہیں دیا
ہے۔ چلو، چل کر علیؑ سے کہیں کہ آپ سیدہؑ کی خواہش کیجیے۔

آئے سب اور علیؑ کو دیکھا کہ ایک باغ میں آبکشی کر رہے ہیں۔ سب کو دیکھ کر
علیؑ نے پانی کھینچنا بند کیا اور پوچھا کہ کیوں آئے۔ کہا، یا علیؑ رسولؐ سے بڑے بڑے
لوگوں نے سیدہ کی آرزو کی مگر سب کو رسولؐ نے ٹال دیا، ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ
کہیں گے تو رسولؐ مان لیں گے۔ یہ سُننا تھا کہ علیؑ رو دیے۔ فرمایا کہ "بھئی! جو
آرزو مٹ چکی تھی اُسے تم نے ابھار دیا اور جس خواہش کو میں سُلا چکا تھا اُسے
تم نے جگا دیا۔ سُنا تم نے، بھلا میں اور سیدہؑ کی آرزو نہ کرتا، مگر کیا کروں کہ مفلس
ہوں"۔ سب نے عرض کی "یا علیؑ! یہ خیال نہ کیجیے، بھلا رسولؐ اور دولت کی فکر کریں،

آپ جائیے تو ہمیں یقین ہے کہ حضرتؐ ضرور مان لیں گے۔" یہ سن کر آپ نے آب کشی بند کی، ناقے کو گھر پہ لاکے باندھ دیا، نعلین پہنی اور سیدہ کی آرزو کرنے رسولؐ کے پاس چلے، دروازے پہ آکے کنجی ہلائی۔ امّ سلمہ نے پوچھا" کون ہے؟" قبل اس کے کہ علیؑ بولیں رسولؐ نے آواز دی کہ" امّ سلمہ! دروازہ کھول دو یہ وہ ہے جو خدا کا بھی دوست ہے اور میرا بھی"۔ امّ سلمہ نے عرض کی" میرے ماں باپ فدا یہ کون ہے کہ ابھی آپ نے اُسے دیکھا بھی نہیں اور یوں کہہ دیا"۔ فرمایا" ہاں ہاں یہ وہ ہے جو نہ سست ہے نہ جلد باز ھٰذَا اَخِیْ وَابْنُ عَمِّیْ وَ اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَیَّ " یہ میرا بھائی ہے یہ میرے چچا کا بیٹا ہے، یہ وہ ہے جو تمام دنیا سے زائد میرا محبوب ہے۔"

یہ سنتے ہی امّ سلمہ یوں دوڑ کے چلیں کہ قریب تھا کہ گر پڑیں۔ یوں تو علیؑ ہمیشہ دروازۂ رسولؐ پر آیا ہی کرتے تھے مگر آج انتظام جدا تھا۔ سواری در دولت پہ پہنچنے سے پہلے خبردار پہنچ گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب علیؑ گھر سے چلے تو ملک آسمان سے چلا، اِدھر علیؑ درِ رسولؐ پر آئے اُدھر ملک نے رسولؐ کو خبر دی۔ اور جبھی ملک تو خادم تھے معصوم کے تو پھر خوشی کے کام تو تیزی سے خادم کیا ہی کرتے ہیں۔

امّ سلمہ نے دروازہ کھولا اور علیؑ مکان میں داخل ہوئے۔ مگر آج کی شان الگ، چلنے کا طرز جدا، نگاہیں جھکی ہوئی، سر خم کیے ہوئے قریب آئے اور سلام بھی کیا مگر نظر نہیں اٹھتی۔ جب رسولؐ نے یہ طریقہ دیکھا تو سمجھے کچھ کہنا ہے۔ فرمایا" علیؑ خاموش کیوں ہو، اگر کوئی حاجت ہو تو بیان کرو، یا علیؑ جو تم کہو گے اور جس بات کی خواہش کرو گے وہ سب منظور۔"

اب آپ سمجھے کہ اوروں میں اور علیؑ میں کیا فرق تھا؟ یعنی لوگ آئے اور کہا مگر رسولؐ نے پلٹا دیا، اور علیؑ نے کہا بھی نہیں مگر رسولؐ نے کہہ دیا کہ یا علیؑ تم جو کچھ کہو گے وہ سب منظور۔ جانتے تھے رسولؐ کہ علیؑ وہ نہیں ہیں کہ جو دل چاہا وہ کہہ بیٹھے! چاہے مناسب ہو یا نہ ہو۔ کسی بات کی آرزو کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اپنی قابلیت دیکھیے مگر نہیں جو منھ میں آیا کہہ دیا۔ لیکن علیؑ وہ تھے جن کے واسطے آیت صدا دے رہی ہے "وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" وہ کسی بات کو چاہتے ہی نہیں جب تک کہ خدا نہ چاہے؟ یعنی دل نہ تھا آئینۂ مشیّتِ خالق تھا۔ ادھر اُس کی مشیّت ہوئی ادھر اُن کے دل میں عکس آیا، اور اگر اُس کی مشیّت نہیں تو اُن کے دل میں ارادہ نہیں۔ گویا ایک لوح آسمان پر تھی اور ایک لوح اہلبیتؑ کے سینے میں تھی جب ہی تو رسولؐ نے کہہ دیا کہ علیؑ تمہاری ہر آرزو مجھے منظور، کیوں کہ بظاہر جسمِ رسولؐ اور جسمِ علیؑ یہ دو تھے مگر دونوں مشیّتِ خدا کے تابع تھے، نہ یہ اپنی طرف سے کچھ کرتے تھے نہ وہ اپنی طرف سے کچھ کرتے، جب مشیّتِ باری ہوئی تو اُن کا بھی قصد، اور جب مشیّتِ باری ہوئی تو اُن کا بھی قصد۔ جیسے مقابل کے دو آئینے اور بیچ میں تصویر، اِدھر بھی وہی عکس اور اُدھر بھی وہی عکس۔ یہ تھا آئینہ خانۂ قدرت، جس میں ایک طرح کے چودہ آئینے اور اُن کے وسط میں آیت کی تصویر "وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" اور اُس کا عکس ہر شیشے میں۔

بہر حال علیؑ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ جب سے میں پیدا ہوا آپ نے آغوشِ تربیت میں لیا۔ ماں باپ موجود تھے مگر آپ نے پالا، آپ نے پرورش کیا، آپ نے تعلیم دی، آپ نے ہدایت کی، میرے لیے جو کچھ کیا وہ آپ نے کیا، اب آرزو یہ ہو کہ آپ

میری خانہ آبادی کی فکر کریں اور سیدہؑ کا نکاح میرے ساتھ منظور کریں"۔ اِدھر علیؑ سر جھکائے کھڑے ہیں اور اُدھر رسولؐ کی خوشی بڑھنے لگی۔ فرمایا! "علیؑ پھر سیدہؑ کا مہر کیا دوگے؟" فرمایا "میرے پاس تو کچھ نہیں، بس ایک تلوار ہے، ایک زرہ ہے، ایک ناقہ ہے، جو فرمائیے مہر میں حاضر ہے"۔ رسالت مآبؐ نے ارشاد کیا کہ "علیؑ تلوار سے جہاد کرنا، ناقے سے آب کشی کرنا، مگر زرہ بے کار ہے تمہارے واسطے خدا کی حفاظت کافی ہے، بس یہی زرہ سیدہؑ کا مہر ہے۔ اور علیؑ میں کیا جو سیدہؑ کی تزویج تم سے کردوں، تجھ سے پہلے تو خدا نے عقد کیا۔ ابھی ابھی قائمہ عرش چھوڑ کر ملک آیا تھا کہ تجھے مبارکباد دے کہ خدا نے تمہارا عقد بزم ملائکہ میں سیدہؑ کے ساتھ پڑھا"۔

بہرحال سیدۂ عالم کا عقد علیؑ کے ساتھ ہوا اور زرہ بیچنے کا حکم ملا۔ جب زرہ علیؑ نے بیچی اور قیمت آئی تو رسولؐ نے اصحاب کے حوالے کی وہ قیمت! اور فرمایا کہ اس میں شاہزادی کا جہیز خریدا جائے۔ اصحاب گئے اور اسباب خرید کے لائے۔ رسالت مآبؐ ایک ایک چیز کو دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خداوندا! ان گھروں کو برکت دینا جن کا اکثر اسباب مٹی کا ہے"۔ نکاح ہوگیا، جہیز آگیا مگر سیدہؑ کی رخصت باقی ہے کہ ازواج رسولؐ نے علیؑ سے کہا کہ "ایک ماہ سے زائد گزر گیا اب تم رسولؐ سے کیوں نہیں کہتے کہ سیدہؑ کو رخصت کریں"۔ فرمایا "مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے"۔ سب نے کہا کہ "اچھا ہم تمہاری طرف سے کہتے ہیں"۔ یہ کہہ کر تمام بیبیوں نے آکر رسولؐ سے کہا کہ "ایک ماہ سے زائد ہوگیا اور آپ نے سیدہؑ کو رخصت نہیں کیا، آخر یہ تاخیر کیوں ہے؟" حضرت نے فرمایا کہ "میں اس کا منتظر ہوں کہ علیؑ کہیں

تو رخصت کردوں، مگر علیؑ نے اب تک نہیں کہا تھا اس لیے خاموش تھا۔ اب وہ کہتے ہیں تو تم میرے گھر میں ایک حجرہ آراستہ کرو۔ اُم سلمہؓ نے حجرہ آراستہ کیا۔ رسولؐ نے علیؑ سے کہا کہ "طعام دعوت مہیا کرو۔" علیؑ سے جو کچھ سامان ہو سکا وہ حاضر کیا رسول خدا نے حکم دیا کہ "یا علیؑ، اب جا کے مدینے والوں کو دعوت دو۔" علیؑ چلے مگر سوچتے ہوئے کہ کھانا کم ہے اگر سب کو بلاؤں تو خجالت ہو گی، اور اگر بعض کو بلاؤں اور بعض کو نہ بلاؤں تو جس کو نہ بلاؤں گا اُسے شکایت ہو گی۔ یہ سوچ کر ایک بلندی پر گئے اور پکار کر آواز دی، "مدینے والو! بنتِ رسولؐ کے ولیمے میں چلو۔" ادھر علیؑ کو یہ خیال تھا کہ جو سن لے گا وہ آجائے گا اور جو نہ سنے گا اُس سے عذر کا موقع رہے گا۔ مگر ہوا نے علیؑ کی آواز تمام مدینے میں پہنچا دی، کوئی گھر نہ تھا جس میں ندائے علیؑ پہنچی نہ ہو۔ علیؑ جو پلٹے تو دروازۂ رسولؐ پر زن و مرد کا ہجوم پایا، شرم سے عرق آگیا۔ رسولؐ نے دیکھا فرمایا گھبراتے کیوں ہو خدا برکت دے گا۔ تم لوگوں کو بلاتے جاؤ، انشاء اللہ یہی کھانا کل آدمیوں کو کافی ہو گا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں علیؑ سے عرض کروں کہ مولا! آپ کو فکر کیا ہے آپ نے تو اُنھیں لوگوں کو بلایا تھا جہاں تک آپ کی آواز جاسکتی تھی اور جو مقام دُور تھے اُن کو خدا نے بلایا تھا آپ پر اُتنے ہی لوگوں کی دعوت فرض تھی جن کو آپ نے بلایا اور جن کو خدا نے بلایا اُن کی دعوت خدا پر تھی۔ اور ہوا بھی یہی کہ تھوڑا کھانا بڑھا اور اتنا بڑھا کہ چار ہزار آدمی سیر ہو کے اُٹھے اور پھر بچا۔ یہ تھا علیؑ کا تصرّف کہ شادی علیؑ کی ہوئی اور دعوت خدا نے کی۔ مگر جس طرح علیؑ کی آواز میں قدرت ملا کے بلایا تھا اُسی طرح علیؑ کے کھانے میں طعام قدرت ملا کے کھلا دیا۔

اور جناب یہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ کے واسطے جو کیا وہ خدا نے کیا جس طرح

عقد ہوتا ہے پسر کا اور شادی کا کل سامان کرتا ہے باپ ۔ یوں ہی شادی تھی علیؑ کی اور سامان کر رہا تھا خالق ۔ یہ نہ تھا کہ سیدۂ عالمؑ میں اور علیؑ میں خدا کے نزدیک فرق تھا ، ایک کی منزلت کم تھی اور ایک کی منزلت زائد تھی ، ہرگز نہیں ۔ مگر بات یہ تھی کہ سیدہؑ کی طرف سے اُن کے پدرِ بزرگوار انتظام کرنے کو موجود تھے اور ابو طالبؑ رحلت کر چکے تھے ، تو خدا نے خود سامان کیا ۔ یعنی زوجہ خود تجویز کی ، عقد خود پڑھا ، نکاح نامہ سیدۃ طرات سے لکھا ، مہر سیدہؑ کو خود دیا ۔ ابھی وہ تو ظاہری مہر تھا کہ زرہ دی گئی یا پانچ سو درہم دیے گئے ، ورنہ حقیقی مہر کچھ اور ہی تھا ۔ رسولؐ نکاح پڑھ کے گھر میں آئے اور سیدۂ عالم پر نگاہ پڑی دیکھا سیدہؑ رو رہی ہیں ۔ فرمایا ، "بیٹی روتی کیوں ہو ؟ خدا کی قسم اگر میرے خاندان میں میرے اہلبیت میں کوئی اور علیؑ سے بہتر ہوتا تو میں تیری شادی اسی سے کرتا ۔ اور میں کیا تیری شادی تو علیؑ سے خدا نے کی ۔" ہاں جناب اب بھی کچھ شک ہے کہ علیؑ اہلبیت میں داخل اور داخل کیسا کہ افضل ترین اہلبیتؑ ۔ اس کے بعد شاید رسولؐ کو خیال آیا کہ سیدہؑ اس لیے تو نہیں روتی ہیں کہ مہر کم ہے تو آپ نے ارشاد کیا ، " سیدہؑ میں بتاؤں کہ خدا نے تجھ کو مہر کیا دیا ؟ سُن پارۂ جگر ! تمام خمس جو واجب ہے سب تیرا ہے اب سے اور قیامت تک ، اور تمام زمین کا پانچواں حصہ یہ تیرا مہر ، اور چار نہریں وہ بھی مہر میں داخل ، اور اب بھی کم ہے تو دوزخ بھی دی کہ دشمنوں کو جگہ دینا اور اب بھی کم تو جنت بھی دی کہ دوستوں پر بانٹ دینا ۔" یہ سب وہ مہر ہے جو سیدہؑ کو خدا نے دیا علیؑ کی طرف سے ۔

بہر حال جب دعوت ختم ہوئی تو علیؑ کو رسولؐ نے بلایا اور امّ سلمہ سے ارشاد کیا کہ جاؤ سیدہؑ کو لے آؤ ۔ امّ سلمہ گئیں اور سیدہؑ کو دلہن بنائے ہوئے لے کے چلیں ، مگر شاہزادی کا

یہ عالم کہ شرم سے سر جھکا ہوا، حیا سے پسینہ ٹپکتا ہوا، اُمّ سلمہؓ سنبھالے ہوئے اور اس کے بعد بھی قدم میں لغزش، یہاں تک کہ باپ کے قریب آ گئیں۔ رسالت مآبؐ نے نقاب بیٹی کے چہرے سے اُلٹی، علیؑ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، فرمایا "یا علیؑ! خدا تجھ کو رسولؐ کی بیٹی میں برکت دے، فاطمہؑ بڑی اچھی زوجہ ہے۔" اس کے بعد متوجہ ہوئے سیدۂ عالم کی طرف اور ارشاد کیا "اے سیدہؑ! علیؑ بڑا اچھا شوہر ہے۔" یہ فرما کر حکم دیا کہ "اچھا اے علیؑ اب سیدہؑ کو اپنے گھر لے جاؤ"۔ علیؑ دلھن بیاہ کے چلے۔ مگر چلنے کی شان تھی اور دوہری شان، ایک باطنی جو خدا کی طرف سے دوسری ظاہری جو علیؑ کی طرف سے۔ قاعدہ ہوتا کہ جو بیاہ کرنے جاتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جو دولھا والے ہوں؟ یہاں خدا نے سب سامان علیؑ کی طرف سے کیا تو براتی بھی وہی بنائے جو عرش والے ہوں چنانچہ اکثر فقہائے عامہ نے جابر سے روایت کی ہے کہ جب سیدہ رخصت ہو کے چلیں تو بغلۂ شہبا پر سوار ہوئیں اور لجام فرس جبرئیل نے تھامی، اور رکاب سیدہؑ اسرافیل نے پکڑی اور میکائیل عقب میں چلے اور خود رسالت مآبؐ نے لباس سیدہ کا درست کیا، اور ستر ہزار حوریں کنیزوں کی طرح ساتھ چلیں اور ستر ہزار ملک جلو میں چلے۔

یہ تو وہ باطنی شان تھی جس کا انتظام خدا نے کیا لیکن ظاہری شان وہ بھی کچھ کم نہ تھی۔ سیدۂ عالم ایک ناقے پر سوار تھیں، مہار ناقہ سلمان فارسی کے ہاتھ میں تھی، خود رسولؐ آگے آگے رواں تھے، چاروں طرف بنی ہاشم تلواریں کھینچے ساتھ تھے۔ ایک طرف جعفر ایک طرف عقیل، ایک جانب حمزہؑ ایک جانب اصحاب، رسولؐ کی بیویاں شعر پڑھتی ہوئی ساتھ ساتھ۔

یہ تھی وہ شان جس طرح سیدۂ عالم کی سواری رسولؐ کے گھر سے علیؑ کے گھر جا رہی تھی۔ دیکھ لیا آپ نے کہ ماں کی سواری کیوں کر چلی۔ ہاں ہاں پرکھ ہے جب سواری کا انتظام دستوں

کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو یہی شان ہوتی ہے جو مدینے میں زینبؑ کی سواری کی تھی۔ مگر خدا نہ کرے کہ سواری کا اہتمام دشمن کریں جیسے کربلا میں حسینؑ کے اہلبیتؑ کی سواری۔ یہ نہ تھا کہ صرف ماں کی سواری کا وہ اہتمام تھا جو میں کہہ چکا بلکہ اہلبیتِ حسینؑ اُن کی سواری بھی جب مدینے سے چلی تو اہتمام تھا اور حد کا اہتمام۔ حسینؑ کرسی پر رونق افروز، بنی ہاشم کا انتظام، جناب عباسؑ کی نگرانی، ایک ایک بی بی کا آنا، محملوں میں فرش اور اس پر پردے، عترت سے سفر، یہ سب تھا، مگر کربلا سے چلی سواری تو یوں کہ اونٹ وہ جن پر نہ کجاوہ نہ محمل۔ عرب کی دھوپ، اور پھول سے بچے اور جنگل کا سفر، نہ کوئی پردہ، نہ کوئی چادر، طولانی منزلیں، پانی کی کمی، دشمنوں کا ساتھ۔ خدا ہی جانے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں کہ جس کا انتہائی اثر یہ تھا کہ اگر کوئی دوست مل جاتا تھا تو بھی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ کون ہیں۔

مثال کے طور سے ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ عبداللہ ابن قیس انصاری جن کی ماں نے امام حسنؑ کو دودھ پلایا تھا، اس قدر دوست رکھتے تھے ان دونوں شاہزادوں کو کہ جب امام حسنؑ نے رحلت کی انھیں یہ گوارا نہ ہوا کہ مدینے میں رہیں، ترکِ وطن کیا اور حلب میں آکے مقیم ہوئے۔ لیکن ان کا قاعدہ یہ تھا کہ ہر سال جب حج سے فارغ ہوتے تھے تو مدینۂ رسولؐ میں امام حسینؑ کی زیارت کرنے ضرور جاتے تھے۔ اس سال بھی جب حج کو گئے تو معلوم ہوا کہ امام حسینؑ کوفے کی طرف روانہ ہوئے ہیں لہٰذا زیارت سے محروم رہے خیال ہوا کہ چل کے کوفے ہی میں زیارت کر دل گا۔ یہ سوچ کر عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کہتے ہیں ایک دن دوپہر کے وقت میں ایک منزل پر پہنچا جہاں درختوں کے سائے میں چشمۂ آب بھی تھا، وقت گرم تھا اس لیے

میں نے وہیں قیام کیا۔ ابھی کچھ دیر زیادہ نہ گزری تھی کہ گرد بلند ہوتی ہوئی نظر آئی جب گرد کا دامن پھٹا تو کچھ سیاہ نشان دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کسی لشکر کی آمد ہے۔ سنبھل کے بیٹھ گیا۔ جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا ایک لشکر سیاہ علم ہاتھوں میں لیے چلا آتا ہے۔ یہاں تک جب وہ لوگ قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ ہر شخص پیاس کے مارے بے چین ہے۔ زبانیں منہ کے باہر ہیں، پانی کی تلاش میں ہر طرف نگاہیں دوڑ رہی ہیں، جیسے ہی لشکر کی نگاہ چشمے پر پڑی سب نے جلدی جلدی گھوڑے خالی کیے، پانی پیا، سیر ہوئے۔ جب یہ لوگ اُتر چکے تو بار برداری کے ناقے آئے، خیمے لگائے گئے، لنگر استادہ کیے گئے۔ پانی چھڑک کے گرم زمین ٹھنڈی کی گئی، جو سرداران سپاہ تھے وہ خیموں میں گئے، جو معمولی لشکر والے تھے وہ بھی سائے میں، یہاں تک کہ گھوڑے تک درختوں کے نیچے باندھ دیے گئے۔

عبداللہ کہتا ہے کہ جب میری نگاہ آخر لشکر پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ کچھ عورتیں بے مقنعہ و چادر، بالوں سے چہرے چھپائے ہوئے، بعض بی بیاں ننھے ننھے بچے گود میں لیے ہوئے شتران بے کجاوہ و محمل پر سوار چلی آتی ہیں۔ جب یہ لوگ منزل کے قریب آئے تو اپنی اپنی سواریوں سے اُترے۔ مگر ایک جوان نحیف و لاغر، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوق، ایک شتر لاغر پر سوار تھا، جب چاہتا تھا کہ اونٹ سے اُترے قوت ساتھ نہ دیتی تھی۔ آخر جب بہت کوشش کی منہ کے بھل ناقے سے زمین پر گرے۔ یہ دیکھتے ہی تمام بیویوں نے گرد حلقہ کر لیا اور فریاد وامحمدؐ لہٰ واعلیاہ بلند کی۔

عبداللہ کہتے ہیں کہ اس اثنا میں میں نے دیکھا کہ ایک معظمہ طویل القامت

ایک بچی کو گود میں لیے ہوئے پانی کے قریب آئیں، ادھر تو پانی پر نگاہ پڑی ادھر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چلّو میں پانی لیا اور پھینک دیا۔ رُخ کیا کربلا کی طرف اور آواز دی "بھیّا، بھیّا! تم پیاسے قتل ہو جاؤ اور میں پانی پی لوں"۔ یہ دیکھ کر عبداللہؓ کے آنسو نکل پڑے کہ ایک معظمہ سیاہ کفنی پہنے ہوئے قریب آئیں۔ فرمایا، "بندۂ خدا ہمارے پاس سے ہٹ جا تو نا محرم ہے۔" عبداللہؓ نے جواب دیا کہ "بی بی میری کیا مجال کہ میں نگاہِ بد سے دیکھوں۔ اگر بُرائی سے نگاہ کی ہو تو خدا مجھے نابینا کر دے، مگر تمھاری حالت دیکھ کر بے چین ہو گیا اس لیے رو رہا ہوں۔" اُس معظمہؓ نے پوچھا "تو کون ہے، اور کہاں جاتا ہے؟" عبداللہؓ نے کہا کہ "میں عبداللہ ابن قیس انصاری ہوں اور کوفے جاتا ہوں کہ اپنے بھائی کی زیارت کروں۔" اُس معظمہؓ نے پوچھا کہ "کون بھائی؟" کہا، "دین و دُنیا کا شاہزادہ حسینؑ ابن علیؑ۔" یہ سننا تھا کہ اُن معظمہ کو تابِ نہ رہی، فرمایا "واہ! اے عبداللہؓ! واہ، اب ہم ایسے ہو گئے کہ ہمارے دوست بھی ہم کو نہیں جانتے۔ کس کی زیارت کو جاتا ہے، عاشور کو پنجتنؑ کا خاتمہ ہو گیا اور دیکھ وہ نیزے کی نوک پر تیرے آقا کا کٹا ہوا سر ہے۔"

مجلسِ دوم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوٰتُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَشَفِیْعِ الْمُذْنِبِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ وَاَهْلِبَیْتِهِ الطَّاهِرِیْنَ ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ " وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ کُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ کُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ٥

عالم کی بستی اولادِ آدم سے بسانے کے بعد حقوق کی تعیین، فرائض کی تعلیم، واقعات کی خبریں، حالات کی تفصیل، جزا کی تقسیم کرنے والا، قرآنِ مجید میں اپنے حبیب اپنے رسولؐ اپنے رازدار سے ارشاد کرتا ہے کہ " میرے کریم بندے سُن! میں نے انسان کو وصیت کر دی تھی کہ وہ اپنے والدین سے نیکی کرتا رہے ۔ سُنا میرے حبیب! یہ میں نے اس انسان کو وصیت کی جو بطنِ مادر میں آیا تو اُس کی ماں کو رنج پہنچا اور جس کی ولادت

کے وقت بھی اُس کی ماں رنجیدہ ہی تھی اور کل تیس مہینوں میں اُس انسان کی مدتِ حمل بھی گزر گئی اور دودھ بڑھائی بھی ہوئی۔ بچپنا گزرا شباب کی ابتدائی گھڑیاں ختم ہوئیں چالیس برس کا سن ہوا تو اُس دن اُس انسان کی تمام قوتیں کامل ہوئیں اب اُس انسان نے ہماری بارگاہ میں دستِ دعا بلند کیے اور الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی کہ میرے مالک میرے پیدا کرنے والے میری مدد کر اپنی رحمت شاملِ حال کر کہ میں تیری اُن نعمتوں کا بھی شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھ کو دیں اور ان نعمتوں کا بھی شکریہ ادا کروں جو تو نے میرے ماں باپ کو دیں اور پروردگار! میری مدد کرنا کہ میں اپنی زندگی میں ایسے نیک کام کر جاؤں جن سے تو راضی ہو جائے اور میری ذریت میں بھی نیک بندے قرار دے۔ میں تیری بارگاہ میں ہر وقت اپنی کوتاہیوں کا معترف ہوں اور توبہ کرتا ہوں اور میں تیرے ہر حکم کی اطاعت کرنے والوں میں ہوں۔"

قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں جمادات کا ذکر ہے، نباتات کا ذکر ہے، انسانوں کا بیان ہے، جنوں کا بیان ہے، ملائکہ کا تذکرہ ہے، جانوروں کا ذکر ہے۔ مگر اس آیت میں مخصوص کیا گیا ہے صرف انسان کو۔ لفظ بھی خاص ہی ہے اور مطلب بھی خاص ہی ہے۔ یہ نہیں ارشاد ہوتا کہ ہم نے اپنی تمام مخلوق کو وصیت کی، یہ نہیں ارشاد ہوتا کہ ہم نے تمام جان داروں کو حکم دیا۔ بلکہ چُنا گیا اور صرف انسان۔ کیوں کہ وصیت وہ تھی جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ والدین سے احسان اور نیکی، نہ اس حکم کا تعلق جمادات و نباتات سے ہو سکتا ہے، نہ ملائکہ اور حیوانات سے۔ کیوں کہ جمادات و نباتات کسی حکم کے سننے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں۔ ملائکہ میں توالد و تناسل اور باپ بیٹے کے رشتے ہی نہیں۔ حیوان میں یہ سلسلہ موجود ہے تو عقل نہیں جس کے ذریعے سے فرائض کو سمجھیں اور اطاعت کریں۔ اسی لیے صرف

انسان چُنا گیا کہ جس میں علم بھی ہے اختیار و قدرت بھی ہے۔ سمجھ لینے کی طاقت اور عمل کرنے کی قوت بھی ہے۔ تیرے واسطے ماں باپ بھی ہیں۔ لہٰذا تجھ کو حکم دیا جاتا ہے کہ تو اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔ الفاظِ آیت صاف ہیں، معنوں میں بھی کوئی دقّت نہیں۔ ہر وہ شخص جو عربی سے واقف ہے اچھی طرح سمجھ لے گا، بہت آسانی سے آیت کے معنی ڈھونڈھ لے گا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس آیت میں ہر انسان کا ذکر ہے یا کسی خاص انسان کا، آدم کی تمام اولاد کا تذکرہ یا کسی خاص شخص کا، نوعِ بشری مراد ہے یا کوئی فرد خاص ـــ بے شک جو مستقیم القامت ہو، دو ہاتھ ہوں، ہر ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوں، دو پیر ہوں خاص قسم کا جثہ ہو، آنکھیں ہوں، ناک ہو، کان ہوں، دل و دماغ ہو، عقل و ہوش ہو، صورت و شکل وہی ہو جو خداوندِ عالم نے جناب آدم کو عطا کی تھی، وہ انسان ہے اور جناب آدمؑ کی اولاد ہے۔ مشرق میں ہوں، مغرب میں ہوں، ممالکِ جنوبی میں ہوں یا ممالکِ شمالی میں، سیاہ ہوں یا سفید، مومن ہوں یا کافر سب کے سب آدم کی اولاد ہیں، اور سب کے سب انسان ہیں، بشر ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ سب انسان کہے جانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ تمام کے تمام حقیقتاً بشر ہیں۔ یا نہیں۔ ظاہر بیں نظر کرنے والے کہہ دیں گے کہ سب انسان سب بشر۔ مگر جب آپ باطن کو دیکھیں گے صورت سے نگاہ موڑ کے سیرت پر نگاہ ڈالیں گے اور عقل کی زبردست کسوٹی پر پرکھیں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ صورت میں تو سب ہی انسان ہیں مگر سیرت میں ہر شخص انسان نہیں۔

اگر افعال و عادات، خواص و صفات کا اعتبار کوئی چیز ہے تو انھیں انسانی صورت والوں میں آپ کو شیطان ملیں گے، درندے ملیں گے، سانپ ملیں گے، عقرب

ملیں گے، بھیڑیں ملیں گی، بکریاں ملیں گی، گدھے ملیں گے، کتے ملیں گے — اور انھیں انسانی صورت والوں میں آپ کو حقیقی انسان ملیں گے بلکہ ملک ملیں گے، امام ملیں گے، نبی و رسول ملیں گے۔ ہوں گے سب اسی زمین پر اور اسی فلک کے نیچے، اور اسی لباس بشری میں، ایک ہی مجلس میں، ایک ہی محفل میں، بظاہر ایک ہی منزل میں، مگر سب کے سب ایک ہی سے ہوں؟ ہرگز نہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنی نکتہ رس نگاہوں سے وجہ تفریق پر غور کریں، وجہ اور سبب ڈھونڈھیں کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں یہ فرق کیسا کہ ایک ہابیل ایک قابیل، ایک مظلوم ایک ظالم، ایک مقتول ایک قاتل، کوئی انسان کوئی شیطان، کوئی فخر عالم انسانیت اور کوئی جانوروں سے زائد پست منزلت۔

وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ پیدا کرنے والے کی مصلحت تھی، اس کی قدرت کے اشارے تھے، اس کے ارادوں کا زور تھا کہ کسی کو اس نے مجرّد بنایا، کسی کو مادّی، کسی کو بسیط بنایا، کسی کو مرکب، کسی کے اجزا کم قرار دیے، کسی کے زائد۔ کسی کو فلکی رکھا، کسی کو عنصری، کسی کو آسمان پر جگہ دی، کسی کو زمین پر۔ کسی کو جامد بنایا کسی کو سیال، کسی کو خشک بنایا کسی کو تر۔ ایک میں حرارت دی دوسرے میں برودت، ایک کو ساکن بنایا دوسرے کو متحرک۔ مادّے ہزاروں قسم کے بنائے، جواہر بے شمار قرار دیے۔ اعراض کی انتہا نہ رکھی اور جواہر میں اعراض کی منزل قرار دی۔ ہر مادّے کو کچھ صفات دیے، کچھ خواص دیے، اثر دیے تاثیر دی۔ ان سب کو پہلے الگ الگ بنایا، پھر ایک سے ایک کو ملانا شروع کیا۔ چند مادّے ملائے اور اس سے جمادات کو بنایا۔ چند عنصر ملائے اور اس سے ایک موجود بنا دیا۔ کچھ صفات کا اضافہ کیا اور نباتات بنا ڈالے۔ پھر اور اضافہ

کیا اور حیوان بنا دیا، ان کی صورتیں بدل دیں، قوّتیں بدل دیں، حالات بدل دیے، کیفیات میں تغیّر کر دیا۔

یہ تمام چیزیں بنانے کے بعد اب مشیّت باری یوں جاری ہوئی کہ ایک مخلوق ایسا پیدا کروں جس میں سب کچھ ہو، تمام مادّے ملا دوں، تمام عنصر شامل کر دوں، تمام صفات کا مجموعہ بناؤں، تمام خاصیتوں کا نمونہ بناؤں۔ زمین کے اوپر آباد کروں مگر فلکی اجزا بھی شامل کروں۔ تمام مادوں کا مجموعہ بناؤں مگر اس میں مجرّدات کی بستی بساؤں۔ ظاہری نظر میں ظلماتی قرار دوں مگر باطن کے پردوں میں نور رکھوں۔ پہلے تو میں نے یوں بنایا کہ کسی میں دو چیز دی کسی میں چار، کسی میں دس کسی میں بیس۔ پھر میں نے حیوان کو یوں بنایا کہ اس میں تمام عنصر جمع کر دیے، ہر شے کا حیوان کو نمونہ بنایا۔ مگر اب میں اپنی قدرت کا وہ مظہر قرار دوں جس میں تمام مادّے، تمام عنصر، تمام صفات مادہ، تمام خواص عنصری کے ساتھ ہی ساتھ فلکی اجزا فلکی خواص روحانیت کے حصّے، غرض تمام مخلوقات عالم کا مجموعہ بناؤں مشیت باری جاری ہوئی، قدرت کے زور نے اثر دکھایا۔ الٰہی ارادے متوجّہ ہوئے، تمام مادّے سمٹ کے آئے، تمام عنصر یک جا ہوئے، تمام صفتوں نے بستی بسائی، فلکی اجزا کھنچ کھنچ کے آئے، ملکی صفات اُترنے لگے، روحانیت نے مادے میں بستی بنائی، جواہر و اعراض یک جا بیٹھے، روحیں بھی آخر کھنچ کھنچ کے آئیں، تمام مخلوقات دست و گریباں ہوئے اور اس مجموعے کا نام انسان ہوا۔

وسعت عالم اتنی کہ عمر کی گھڑیاں تمام عالم کی سیاحت کرنے میں ناکافی۔ اور پھر فلک کی بلندی اس قدر جہاں تک نگاہوں بلکہ دوربینوں کی رسائی ناممکن۔ اور مخلوقات کی تعداد اس قدر کہ ہمارے حساب کی حدوں میں لامتناہی۔ خلاقِ عالم

جانتا تھا، اُس کو علم تھا کہ اگر کوئی دریافت کرنا چاہے ہر ہر چیز تک رسائی چاہے، تمام مخلوقات پر نظر کرنا چاہے تو اس کی عمر تمام ہو جائے گی، بصارت کی قوت جواب دے دے گی، حواسِ خمسہ ختم ہو جائیں گے مگر میری مخلوقات کا احاطہ، اُن کا شمار، اُن تک رسائی ناممکن ہو گی۔ لہٰذا ایک ایسی مخلوق ہو جس میں سب کچھ ہو، ایک ایسا نمونہ ہو، ایک ایسا گُل دستہ ہو جس میں ہر پھول ہو، ہر رنگ ہو، ہر مہک بُو اثر ہو، ہر قسم کی پتیاں ہوں، ہر طرح کی شاخیں ہوں، تمام دُنیا کے رگ و ریشہ ہوں۔ جیسے کوئی باغ بنائے اور باغ میں ہر قسم کے پھول ہوں، پھل ہوں، درخت ہوں، اشجار ہوں، تختے ہوں، چمن ہوں، روشیں ہوں، کیاریاں ہوں۔ اور تمام باغ کا مجموعہ ایک گُل دستے میں جمع کر دے۔ مگر ایسا گُل دستہ نہیں جس میں پھول ہوں خار نہ ہوں، پتیاں ہوں شاخیں نہ ہوں، رنگینی ہو بے رنگی نہ ہو، فائدے ہوں ضرر نہ ہوں، خوش بو ہو بد بو نہ ہو۔ جی نہیں، ایسے گُل دستے وہ بناتا ہے جس کا مطلب صرف نظر فریبی ہو مگر جو یہ چاہے کہ تفریح کرنے والوں کو تمام چمن میں قدم زنی کی زحمت نہ دے بلکہ ایک ایسا نمونہ بنائے جس میں بیک نگاہ تمام باغ کی چیزیں نظر آ جائیں، وہ انتخاب نہیں کرتا بلکہ تمام پھول، تمام پھل، تمام قسمیں ایک ہی سبد میں جمع کر دیتا ہے۔

مشیتِ خالق بھی یہی تھی کہ میں انسان کو ایسا گُل دستہ بناؤں جس میں چمنِ عالم کے تمام پھول ایک ہی جگہ موجود ملیں۔ لہٰذا اُس نے انسان میں ہر چمن کے پھول جمع کیے، ہر گلشن کی نمائش کی، ہر عالم کا رنگ بھرا، ہر صفت کی بو عطا کی۔ خار بھی دیے اور ثمر بھی، فلکی بھی اور خاکی بھی۔ جب ہم نے اس گُل دستے پر، اس نمونے پر، اس مجموعۂ عالم پر نگاہ کی تو ہمیں انسان کے سوا خاک نظر نہ آیا۔ مگر علیؑ سے نقادِ حقیقت شناس

بے نظیر فلسفی نے نظر ڈالی تو بے ساختہ زبانِ مبارک کو جنبش ہوئی اور ارشاد فرمایا
اَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَ فِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ

"او بے بصیرت انسان کیا تو اسی دھوکے میں ہے کہ تو ایک مختصر ایک چھوٹا سا جسم ہے حالاں کہ اگر تو غور سے دیکھے تو تمام عالم اکبر، ارضی و سماوی، عنصری و فلکی، گرم و سرد، مادی و مجرد، جواہر و اعراض سب ہی کچھ موجود ہے۔"

ہماری نگاہوں میں دم نہیں، ہمارے علم میں زور نہیں، ہماری تشریح میں قدرت نہیں، ہمارے معلومات نارسا ہیں کہ ہم اس قولِ علیؑ کی تفصیل کرسکیں کہ ایک انسان میں کیا کیا ہے اور یہ مختصر جسم کن کن چیزوں کا مجموعہ ہے لیکن اگر امیر المومنینؑ سا حلّالِ مشکلات ہوتا، عقدہ کشائے عالم ہوتا، دُنیا کی مخلوق سے باخبر عالم ہوتا تو تفصیل کرتا کہ ہم کن چیزوں کا مجموعہ ہیں اور کون کون سی چیزیں ہم میں موجود ہیں۔ سوال ہو سکتا ہے کہ یا علیؑ! جب آپ فرماتے ہیں کہ اے انسان تجھ میں تمام عالم پوشیدہ ہے، ہر شے موجود ہے، تو یہ بھی ارشاد ہو کہ اس عالم اکبر میں تو مخلوقات بھی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ خالق بھی ہے۔ یہ مانا کہ انسان تمام مخلوقات کا مجموعہ ہے مگر کیا اسی انسان میں خالق بھی ہے؟ اللہ بھی ہے؟ رب العالمین بھی ہے؟ اگر یہ سوال پیدا ہوگا تو حدیث قدسی آواز دے گی "میں اپنے عرش کی وسعت میں نہیں سماتا مگر مومن کے دل میں جگہ ہے میری" اور امیر المومنینؑ ارشاد کریں گے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا" اور تیرہ معصوم سامنے آئیں گے کہ ہم کو دیکھو خدا کے صفات کے مظاہر ہیں یا نہیں؟

تو معلوم ہوا کہ انسان میں ہر مادہ اور عنصر، اور ہر جوہر اور ہر مخلوق اور ہر مخلوق کے

صفات، آثار، خواص سب ہی کچھ موجود ہیں مگر ہر انسان کا فعل ہے اس کی پسند اور اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایسے صفات کا مظہر بن جائے جو اس کو جماد سے ملا دیں۔ مگر ایسے ہی صفات کا نمونہ بن جائے جو اس کو نبات بنا دیں، یا اپنے میں ایسے آثار اور خواص پیدا کر دے کہ دنیا اس کو جانور سمجھ لے۔ کبھی یہی انسان شیطان ہو جائے جس کو دنیا بھی شیطان کہے اور قرآن بھی کہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ "اے رسولؐ! جس طرح تمہارے دشمن ہیں اسی طرح ہر نبی کے واسطے دشمن ہوتے آئے جو شیطان ہیں انسانوں میں سے اور جنوں میں سے۔" اس آیت کے بعد کون مسلمان ہے جو یہ کہہ سکے کہ انسان شیطان نہیں ہوتا۔ اس انسان کی حقیقت نہیں بدلی، اصل نہیں بدلی، صورت و شکل نہیں بدلی، البتہ سیرت بدلی صفات بدلے۔ اس نے اخلاق و عادات وہ اختیار کیے جو ابلیس کے تھے۔ لہٰذا صرف اسی سیرت اور انھیں صفات کی وجہ سے اس نرے کھرے انسان کو شیطان کہا گیا۔ تو جنابِ عالی جب صفات نے اس انسان کو شیطان بنا دیا تو جس میں شیطنت کی صفت موجود ہو اس پر لعنت سے نہ رد کیے۔ جائز اور بالکل جائز، قرآن کے نزدیک جائز اور ہر قرآن کے ماننے والے کے نزدیک جائز۔ یہ ثابت کرنا ہمارا کام کہ اس میں شیطنت تھی اور پھر لعنت کرنا ہر اس مسلمان کا کام جو قرآن کو مانتا ہے۔ نہ فرمایئے گا کہ لعنت صرف اسی شیطان کے واسطے جائز و صحیح ہے جس کا نام ابلیس تھا دوسرے کے واسطے جائز نہیں۔ کیوں کہ میں عرض کروں گا کہ اگر ابلیس کی ذات مستحقِ لعنت ہوتی، اور عزازیل اپنی حقیقت کے اعتبار سے مستحقِ لعنت تھا تو تو یہ قول بے شک درست ہے کہ عزازیل ہر طرح کی لعنت کا مستحق ہے لیکن اور انسان جن کو شیطان کہا جائے مستحقِ لعنت نہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابلیس اپنی اصل، اپنی ماہیت کے اعتبار سے مستحق لعنت نہ تھا بلکہ اپنی سیرت و خصلت کی وجہ سے مستحق لعنت ہوا۔ جب تک عبادت کرتا رہا بزم ملک میں شریک رہا، بعدہٗ آدم سے انکار نہ کیا اُس وقت تک نہ خدا نے لعنت کی نہ کسی بندے نے، نہ در اصل مستحق لعنت تھا بلکہ جب اُس نے نافرمانی کی اور شیطنت شروع کی اس وقت مستحق لعنت ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ لعنت کا استحقاق صفت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ تو اب اصل نہ دیکھیے، حقیقت نہ دیکھیے بلکہ صفت دیکھیے۔ اس صفت کے بدلنے سے قرآن نے شیطان کہا اور استحقاقِ لعنت لقب شیطان کے ساتھ آیا چاہے کوئی ہو۔

تو معلوم ہوا کہ اگر انسان نے جانوروں کے صفات حاصل کر لیے، ویسے عادات و اخلاق اختیار کر لیے جو جانوروں کے تھے تو جانور بن گیا اور اگر ایسے عادات و اخلاق اختیار کیے، ویسی سیرت بنائی جو شیطان کی تھی تو شیطان ہو گیا۔ اس مقام پر آتا اور عرض کر دوں کہ لوگ اور بعض نافہم لوگ کہہ بیٹھتے ہیں حضور عادات و اخلاق ماہیت اور حقیقت کی وجہ سے ہوتے ہیں، جیسی جس کی حقیقت ہوتی ہے، جیسی جس کی ماہیت ہوتی ہو، جس جس اجزا کا ماہیت میں غلبہ ہوتا ہے ویسے ویسے اس کے اخلاق و عادات و صفات ہوتے ہیں۔ کسی میں مٹی کا جزو غالب ہے اس کے صفات اور ہوں گے، کسی میں ناریت کا جزو غالب ہے اس کے صفات اور ہوں گے کسی میں نورانیت غالب ہے اُس کے صفات اور ہوں گے لہذا انسان مجبور ہے۔ اگر ہم کو بھی خدا نور سے بناتا جس طرح اُس نے انبیاء اور معصومین کو بنایا تو ہمارے بھی صفات و حالات ویسے ہی ہوتے جیسے ائمہ معصومین کے لیکن ہم کریں کیا کہ وہ حقیقت ہیں، وہ اصل نہیں، ماہیت نہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اس حد تک تو میں بھی مانتا ہوں کہ کسی خاص جزو کے غلبے سے انسان کو ایسے ہی صفات حاصل کرنے میں آسانی ضرور

ہوتی ہے لیکن یہ نہیں تسلیم کرتا کہ جو جزوِ غالب ہو اُس کے صفات حاصل کر لینے میں انسان مجبور ہے، اس کے خلاف صفات حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ اور اس کی بالکل کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا اور معصومینؑ نور سے پیدا ہوئے تو اگر معصوم نور کی وجہ سے نیک کام کرنے پر اور بُرائی نہ کرنے پر مجبور تھے تو ابلیس آگ کی وجہ سے اور مادی مخلوق ہونے کے سبب سے بُرائی کرنے اور نافرمانی کرنے پر مجبور تھا لیکن اگر مجبور تھا تو برسہا برس وہ مومن کیوں رہا، مطیع کیونکر رہا؟ ایسی زبردست عبادتیں کیونکر کیں کہ ملک کا پہلو نشین ہو گیا؟ اگر آتشی مخلوق ہونے کی وجہ سے آتش مزاجی پر اور نافرمانی پر مجبور تھا تو ہزاروں برس ابلیس نے اپنی آتش مزاجی پر کیونکر قابو حاصل کیا؟

معلوم ہوا کہ نہیں حقیقت اور ماہیت مجبور نہیں کرتی، یہ اپنا اختیاری فعل ہے کہ جب تک چاہا نافرمانی کی اور جب چاہا مطیع بن گیا، جب تک چاہا عبادت کی جب چاہا مردود بن گیا۔ تو جس طرح ناری مخلوق ہونے کی وجہ سے شیطان بدکاری یا نافرمانی پر مجبور نہ تھا یوں ہی کوئی انسان نوری مخلوق ہونے کی وجہ سے اطاعت، فرماں برداری اور عبادت پر مجبور نہیں ہے۔ معصوم ہوں کہ نورانی لیکن مطیع خدا اپنے اختیار سے ہوئے، ارادے سے ہوئے، پسند سے ہوئے۔ تو اب عام انسان بھی کسی ملک میں ہوں، کسی فضا میں ہوں، کسی آب و ہوا میں ہوں، اُن کے اجزائے حقیقت میں کیسا ہی تفرقہ کیوں نہ ہو، لیکن وہ جانور بنتے ہیں تو اپنے اختیار سے، شیطان بنتے ہیں تو اپنے ارادے سے۔ لہذا کچھ انسان صفات اختیار کر کے ایسے بنے جن کا میں ذکر کر چکا اور کچھ ایسے بنے جن کو دنیا نے انسان کہا اور قرآن نے بھی ارشاد کیا خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ اور بعض ایسے بن گئے جن کیلئے قرآن

نے کہا یا اَیُّھَا النَّبِی "۔ "یا اَیُّھَا الرَّسُوْل "۔ "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا
رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن "۔ بلکہ دُنیا نے اُن کی صورت دیکھ کے ملک مقرب کہا
جیسے زلیخا کے مکان میں یوسف کی منزل اور حُسن کے جلوے بالکل بے نقاب
اور اس منظرِ حُسن کو دیکھ کر دُنیا والوں کی آواز حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا
اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ " خدا کی پناہ! یہ ہرگز انسان نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔
لاکھ انکار کریں دیکھنے والے کہ یہ انسان نہیں، ملک ہے مگر عقل کہے گی کہ حقیقت
نہ بدلی تھی اصل نہ بدلی تھی جو نبی بن گیا وہ بھی انسان ہی تھا جو رسول بن گیا وہ بھی
بشر ہی تھا، جو ملک کہا گیا وہ بھی آدم کی اولاد ہی تھی، بلکہ جو ملک سے بھی بلند ہوگیا،
بہتر ہوگیا، افضل ہوگیا، وہ انسان ہی تھا۔ اور خود زبان فیض ترجمان پہ اعتراف تھا
اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ " میں تمھاری ہی طرح کا انسان ہوں "۔ اب شاید کسی کو
محلِ انکار نہ رہے گا کہ صورت سب کی ایک ہے، ہاتھ پیر سب کے ایک ہیں، دل و دماغ
سب کا ایک ہے، البتہ فرق جو کچھ ہے وہ سیرت کا ہے، افعال کا ہے، عادات و اخلاق کا
ہے اسی وجہ سے قرآن حکیم بھی جب صورت کے اعتبار سے آیتیں نازل کرتا ہے تو
تمام اولادِ آدم کو انسان کہہ دیتا ہے اور جب سیرت پر نظر کر کے خطاب کرتا ہے تو کچھ خاص
بندوں کو انسان کے لقب سے ملقب کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ
الْحَكِیْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ "یٰسین، قسم ہے قرآن حکیم کی تو یقیناً
مرسلین میں سے ہے"، تفسیر کہتی ہے کہ یٰسین سے مراد ہے اے انسان، مگر دنیا کا کوئی
بشر نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ہر انسان مراد ہے، کیونکہ آیت ارشاد کرتی ہے کہ اے انسان تو
پیغمبر مرسل ہے اور معلوم ہے کہ ہر انسان مرسل نہ تھا بلکہ جب یہ آیت اتری تو دو چار انسان بھی

ایسے نہ تھے جو مرسل ہوں۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ وہ ایک ہی ذات تھی جسے انسان کہہ کے مخاطب کیا گیا اور وہ محمد مصطفٰے تھے۔ لہذا معلوم ہوا کہ خاتم النبیین کی ذات وہ الاصفات تھی کہ خالق کون و مکاں اُسے انسان کے لقب سے ممتاز کرے۔ اور چلیے، ارشاد ہوتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ "خدا نے قرآن کی تعلیم دی اور انسان کو پیدا کر کے بیان سکھایا" اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جن کو قرآن کی تعلیم دی گئی وہ محمد مصطفٰے خاتم النبیین سید المرسلین ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ انسان کون جس کو بیان کی تعلیم دی گئی۔ دنیا کہہ سکتی ہے کہ وہ عام انسان، مگر ذرا بے ربط ہو گا کہ محمدؐ کے ذکر اور تعلیم قرآن کے تذکرے کے بعد عام انسانوں کا ذکر کیسا؟ کہاں تو یہ کہ ہم نے اپنے حبیبؐ کو قرآن سکھایا اور کہاں یہ ارشاد کہ انسان کو پیدا کیا اور بیان سکھایا۔ فہم سلیم فیصلہ کرے گی کہ اگر پہلا ٹکڑا محمد مصطفٰے کے بارے میں ہے تو دوسرا ٹکڑا بھی کسی ایسے ہی انسان کے بارے میں ہے جو برابر کا نہ ہو تو کم از کم ذات محمدؐ کے بعد اُس سے زائد کوئی دوسرا البشر انسان کہے جانے کا مستحق نہ ہو اور اگر آیت کے پہلے حصے میں قرآن کا تذکرہ ہے تو دوسرے حصے میں بیان سے مراد آیات ہی کا بیان ہے عام قوتِ گویائی مراد نہیں ہے۔ اسی لیے تفسیر معصومین ہے کہ جس کو قرآن کی تعلیم دی گئی وہ محمدؐ اور جس انسان کو خلق کر کے بیان سکھایا گیا وہ علی مرتضٰیؑ۔ ان آیتوں نے صاف بتا دیا کہ خداوند عالم جس کو بشر کہتا ہے، جس کو انسان کہتا ہے، جس کو ناس کہتا ہے وہ انبیاء ہیں، مرسل ہیں، علیؑ سا بشر ہے یا محمد مصطفٰے ہیں۔ ابھی تک آپ اتنا ہی فرما سکتے ہیں کہ پیدا کرنے والا جس انسان کو اپنے خطاب کے قابل قرار دیتا ہے جن کو بات کرنے کے لائق سمجھتا ہے، جن کو حقیقی انسان کہتا ہے وہ انبیاء ہیں، مرسلین ہیں یا

اور یا زائد سے زائد علیؑ ابن ابی طالب ہیں۔ مگر نہیں میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آل محمدؐ کُل کے کُل، خاتم النبیینؐ کے وصی تمام کے تمام، علیؑ کے جانشین ایک کے بعد ایک اس قابل تھے کہ وہ انسان کہے جائیں۔ اور یہی دراصل انسانیت کے بے نظیر نمونے تھے جو حقیقی انسان کہے جانے کے مستحق تھے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جانوروں کی اولاد جانور ہوگی۔ اگر صرف صورتاً کوئی انسان ہو تو اُس کی نسل والے بھی صورتاً انسان کہے جائیں گے لیکن جو کوئی حقیقی انسان ہو تو اُس کی اولاد، اُس کی آل، اُس کے اہل بھی انسان ہی ہوں گے۔ مگر وہ جن کو خدا اہل کہے، جن کو خود پیدا کرنے والا انسان حقیقی کے اہلبیت میں داخل بتائے؟ دنیا والے تو ہر ایک کی اولاد کو، اُس کے قرابت داروں کو، یہاں تک کہ اُس کی بیویوں تک کو اہل میں داخل کر دینے پر تیار ہیں۔ مگر خدا انسان حقیقی کا اہل اسی کو قرار دیتا ہے جو خود بھی انسانِ حقیقی ہو۔ کون ایسا شخص ہے جو یہ کہہ دے کہ جناب نوحؑ کا فرزند اُن کے اہل میں شامل نہ تھا؟ دنیا کہے گی اور ہر بشر کہے گا مگر خدا فرماتا ہے اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ " اے نوح! یہ تمھاری اولاد تو ہے مگر تمھارا اہل نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ہر انسان کی اولاد کو اہل نہیں کہتا۔ لہٰذا وہ جس کو کسی انسانِ حقیقی کا اہل یا آل کہہ دے تو ماننا پڑے گا کہ یہ سب کے سب انسانِ حقیقی ہی تھے۔ اب قرآن کی آیت پڑھیے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ " اے اہلبیتِ محمدؐ! خدا چاہتا ہے کہ وہ تم سے ہر بُرائی کو دُور رکھے"۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ ازواج رسول اس آیت میں داخل ہیں یا نہیں لیکن اس بات پر تمام سُنّی و شیعہ کا اتفاق ہے، سب یک زبان ہیں کہ اولاد رسولؐ اس آیت میں ضرور داخل ہے۔ تو جب پیدا کرنے والے نے اُن کو

انسانِ حقیقی کا اہل کہا تو ماننا پڑے گا کہ یہ سب کے سب انسانِ حقیقی تھے۔

بہر حال جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن نے محمدؐ و علیؑ کو انسان کہا اور پھر تمام معصومین کو اہلبیت رسولؐ اور آلِ رسولؐ کہہ کے ان حقیقی انسانوں کی طرف منسوب کیا تو یہ سب کے سب انسانِ کامل تھے، بشریت کا بے نظیر نمونہ تھے، اس قابل تھے کہ خدا ان کو انسان کہے اور ان سے خطاب کرے، بات کرے اور مخصوصین بارگاہ میں سے قرار دے ۔۔ اتنی مفصّل تمہید کے بعد اب میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ جب خدا نے ارشاد کیا وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ اِحْسَانًا "ہم نے انسان کو وصیّت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے"۔ تو ہم کیا سمجھیں کہ اس انسان سے کون سا انسان مراد ہے۔ وہی انسان جس کی صورت بتائے کہ انسان ہے یا وہ جس کی بصیرت بتائے کہ انسان ہے؟ آیت کے صرف اسی حصّے کو دیکھنے کے بعد تو صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں وصیّت سے مراد ہے نصیحت اور حکم۔ لہذا ممکن ہے کہ ہر انسان مراد ہو جس کو خدا نے اطاعت والدین کا حکم دیا ہو، لیکن اگر وصیّت کے اصلی معنی مراد ہوں تو پھر وہی انسان مراد ہو سکتے ہیں جن کے واسطے خدا کی طرف سے لکھی ہوئی اور مہر کی ہوئی وصیتیں خاتم النبیین پر نازل ہوئیں اور ارشاد ہوا کہ اے ہمارے حبیب! یہ ہماری وصیتیں ہیں تمھارے اوصیاء کے واسطے، علیؑ کو دے دو کہ اس وصیّت نامے کی ایک مہر توڑیں اور جو کچھ وصیت نامے میں لکھا ہے اُس پر عمل کریں اور حسنؑ کو دے دیں۔ حسنؑ دوسری مُہر توڑ کے خدائی دستور العمل کی پابندی کریں اور اپنے آخری وقت حسینؑ کو دے دیں وہ تیسری مُہر توڑیں اور احکام مندرجہ کے مطابق عمل کریں۔ یوں ہی یہ سلسلہ تمھارے آخری وصی تک جاری رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ انسان تھے جن کو انسان کہا جائے اور جو اس قابل ہوں کہ خدا اُن سے وصیت کرے، اُن کو مخاطب قرار دے، اُن کی طرف متوجہ ہو کے احکام نازل کرے اور مطلب یہ ہو کہ عام انسان ان باتوں کو سُنیں اور عمل کریں۔ لیکن نہیں، انسانوں کے سردار، حقیقی انسان ہونے کے علاوہ اس آیت میں جو صفات مذکور ہیں، جن واقعات کی تصریح ہے وہ واقعات وہ صفات بالکل صاف بتا رہے ہیں کہ قرآن عام انسانوں کا ذکر نہیں کر رہا ہے بلکہ جو حقیقی انسان ہیں ان میں سے بھی سب کے سب اس آیت کے مخاطب نہیں ہیں بلکہ ان حقیقی انسانوں، انسانیت کے کامل نمونوں میں سے بھی کوئی خاص ذات نقطۂ نگاہ قدرت ہے۔ ایک خاص فرد کا تذکرہ ہے کہ ہم نے اس کو وصیّت کی، نصیحت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنا، وہ کون انسان؟ وہ کہ جس کی والدۂ معظمہ اُس وقت بھی غمگین تھیں جب وہ بطنِ مادر میں آیا اور جب تک بچہ شکم میں رہا ماں رنجیدہ رہیں اور جب ولادت ہوئی اس وقت بھی غم ہی ہوا۔ اس انسان کی ولادت اور دودھ بڑھائی کا زمانہ صرف تیس مہینے تھا۔ آیت میں جس کا ذکر ہے اُس کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ وہ چالیس برس کے سن تک پہنچا اس کی تمام قوتیں کامل ہوگئیں تو وہ نہ اپنے رب کو بھولا، نہ اپنے ماں باپ کو فراموش کیا بلکہ اُس نے خدا کی بارگاہ میں انتہائی خلوص سے دعا کی "میری مدد کر تاکہ میں تیرا شکریہ ادا کروں نہ صرف اُن نعمتوں پر جو تو نے مجھ کو عطا کیں بلکہ تو نے جو کچھ انعام و اکرام میرے ماں باپ پر کیا اس کا بھی شکریہ ادا کروں"۔ اس انسان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اُس نے دُعا کی کہ "پیدا کرنے والے میں صرف تیرا شکر گزار بندہ بن کے رہنا نہیں چاہتا بلکہ میری یہ بھی تمنا ہے کہ میں تیری رضا اور خوشی کے مطابق عمل

کروں اور تو میری اس آرزو میں میری مدد کرے"۔ اس انسان نے یہ بھی دعا کی کہ "میری نسل میں بھی نیک اور صالح قرار دے"۔ پھر یہ انسان تو بھی کرتا رہا اور اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ میں ہر بات میں تیرا مطیع ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آیت میں کسی کا نام نہیں، کسی کا نسب نہیں، عام لفظ ہے الانسان۔ مگر قیدیں اتنی لگائیں، پتے اتنے بتائے کہ اگر کوئی عقل مند ان پتوں اور ان نشانیوں پر چلنا چاہے تو باب منزل پر پہنچ جانا ضروری ہے۔

سُنیئے ایک تو یہ صورت ہے کہ آپ نے اپنے دوست کا نام بتا دیا کہ لکھنؤ میں فلاں شخص کے مکان پر چلے جاؤ۔ چلا وہ شخص مگر ایک ایک سے نام دریافت کرتا ہوا محلے کا پتہ پوچھتا ہوا، دروازے کا نشان دریافت کرتا ہوا، مشکل ہوگی، اور بہت مشکل، اور اگر کہیں ایک نام کے دو تین آدمی ہوئے تو اور بھی مشکل، اور ممکن ہے کہ جانے والا بھٹک جائے، ڈھونڈھنے والا بھٹک جائے، لیکن اگر آپ نے بتایا اور مکمل پتہ کہ اپنے مکان سے جب نکلنا تو فلاں سڑک پر جانا اور اتنی دور پہنچ کے فلاں گلی کی طرف مُڑنا، اتنی موڑیں ملیں گی، اتنی گلیاں ملیں گی، یہ یہ نشان ہیں، یہ یہ علامتیں ہیں، اس رنگ کا مکان ہے، اس قطع کا دروازہ ہے، دروازے پر اس قسم کے نقش و نگار ہیں۔ چلنے والا چلا، نہ کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت، نہ پتہ پوچھنے کی حاجت آپ کے بتائے ہوئے نشانوں پر نظر جمائے ہوئے، بہکانے والوں کی راہ زنی سے بالکل مطمئن، سیدھا پہنچا اور اسی دروازے پر جہاں آپ نے بھیجا تھا۔

یہی صورت پیدا کرنے والے نے قرآن میں اختیار کی کہ نام بتا کے ذات کو نہ پہچنوایا، بلکہ صفات بتا بتا کے نگاہیں موڑیں۔ علیؑ کو ولایت دینا چاہی تو آیت

اُتاری مگر نام نہ لیا صفت بتائی۔ بہادری کی مدح کی نام نہ لیا صفت کی طرف نگاہ موڑی۔ شبِ ہجرت کا نقشہ کھینچا کہ علیؑ کی بلند منزلت نظر آئے مگر نقش و نگار دکھائے نام نہ بتایا۔ وفائے نذر کی تعریف کی سورۂ دہر اُتارا مگر نام نہ لیے۔ اپنے ارادے کے زور سے طہارت کی آیۂ تطہیر کی بارش ہوئی اہلبیت کہا مگر نام نہ بتائے۔ صرف اس لیے کہ نام مشترک ہو سکتے ہیں، نام قرآن سے نکل سکتے ہیں، حذف ہو سکتے ہیں، لیکن صفت نہیں بدل سکتی اور جب تک قرآن رہے گا تلاش کرنے والوں کی نظر میں مُڑتی رہیں گی۔ وہی طریقہ اس آیت میں بھی رکھا، نام نہ بتایا بلکہ انسان کہا اور اس کے بعد آیت نے صفات بتائے اور ایک نہیں کئی صفتیں۔ کیا آپ پیش کر سکتے ہیں کوئی ایسا انسان کہ جس کی ماں اُس وقت غمگین ہوئی ہو جب وہ بچہ بطن مادر میں آیا ہو؟ کیا آپ دکھا سکتے ہیں کوئی ایسا بشر جس کی ماں زمانۂ حمل تک ہمیشہ رنجیدہ رہی ہو؟ کیا کوئی انسان ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس کے وقتِ ولادت اس کی ماں نے ماتم کیا ہو؟ اور اگر ایسا ہو بھی تو ہر انسان چالیس برس کے سن تک نہیں پہنچتا، بہت سے انسان اس سے قبل ہی مر جاتے ہیں، اور اگر چالیس برس تک پہنچا بھی تو مریض ہوتا ہے یا کم عقل ہی رہ جاتا ہے اس کی تمام قوتیں کامل نہیں ہو جاتیں، اور اگر یہ بھی ہو تو مسلمان نہیں ہوتا، اور اگر مسلمان بھی ہو تو شکر گزار نہیں ہوتا، اور اگر یہ سب بھی ہو تو بارگاہِ الٰہی میں دست بہ دعا نہیں، مدد کا طالب نہیں، اپنی نسل کے صالح اور نیک ہونے کا متمنی نہیں، ایسے افعال و اعمال نہیں کہ خدا راضی ہو۔

لہٰذا صفات، حالات، واقعات سب یک زبان ہیں کہ وہ ایک خاص انسان تھا جس کی سوانح عمری آیت میں مذکور ہے۔ تاریخ میں حالات دیکھ کر، روایات کی

زبانی واقعات سُن کے نظر انصاف اور فہم حقیقت شناس سے کام لے کے ہم بھی بتا سکتے ہیں کہ یہ کون سا انسان تھا، کس بشر کا آیت میں تذکرہ تھا لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم چپ رہیں اور وہی بتائیں جو علوم الٰہی کے حامل حکمت رسالت کے خزینہ دار، رموز و اشارات قرآنی سے واقف، تفسیر و تاویل کتاب کے حق دار، ظواہر و بطون قرآن کے عالم۔ رسول اُمّی کے اوصیا، زمین کے اوپر خلافتِ الٰہی کے مستحق اور ہمارے امام یعنی آل محمدؐ حق رکھتے ہیں کہ تاویل قرآن، تفاسیر آیات کریں، مطلب بتائیں۔ امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں "اس آیت میں عام انسانوں کا تذکرہ نہیں بلکہ میرے جد بزرگوار حسینؑ ابن علیؑ کا تذکرہ ہے۔ وہی مراد آیت ہیں، وہی مصداقِ انسان حقیقی ہیں، ان ہی سے خدا نے وصیت کی" اور حسینؑ ہی کی ذات وہ ذاتِ عالی تھی جس کی ایک ایک صفت قرآن میں مندرج ہے۔ اگر وصیت کے معنی ہیں وعظ و نصیحت، خدائی حکم، تو حسینؑ سے بہتر کوئی ذات نہ تھی جس کو خدا وعظ کرے، نصیحت کرے الہام اور نبی کے ذریعے سے احکام و فرائض کی تعلیم کرے۔ اور اگر وصیّت کی لفظ کو دیکھیے تو صرف حسینؑ ہی مراد تھے جن کے واسطے خدا ہی کی طرف سے خاتم النبیینؐ کے ذریعے وصیتیں نازل کی گئیں۔ میں جانتا ہوں کہ وصیتیں رسول کی جانب سے تھیں، مگر ان وصیتوں کا معین کرنے والا، وصیت نامہ عرش سے اتارنے والا صرف خدا تھا۔ اور اگر انسان کی لفظ پر غور فرمائیے تو حسینؑ ابن علیؑ سے زائد انسانِ حقیقی کوئی نہیں ہو سکتا جس کا نانا انسانِ کامل، باپ انسان حقیقی، ماں انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ، جو اہلبیت رسولؐ، آلِ رسولؐ میں داخل، بلکہ وہ انسان جس کے واسطے رسولؐ سا انسان کامل فرمائے، حُسَیْنٌ مِنِّیْ

وَ اَنَا مِنَ الْحُسَیْن "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ وہ حسینؑ جو تمام انسانوں کا محسنِ حقیقی، جس نے انسان کو انسان بنا دیا، انسانیت کی تعلیم کی، بشریت کی راہیں بتائیں، جس نے بنے ہوئے اور محض ظاہری انسانوں سے جنگ کر کے دُنیا کی نگاہوں سے پردہ ہٹا دیا اور بتا دیا کہ انسان کون ہے حیوان کون ہے۔ انسانیت کے انداز کیا ہیں، حیوانیت کے صفات کیا ہیں۔ لہذا حسینؑ سے زائد کوئی اس امر کا مستحق نہ تھا کہ اُسے لسانِ قدرت انسان کر کے مخاطب کرے اور اُس کو وصیت کرے۔

کہہ سکتا ہوں کہ یہ حسینؑ ہی کی ذات تھی جو رسولؐ کا وصی، باپ کا وصی، بھائی کا وصی، بلکہ محض لفظ کے اعتبار سے خدا کا وصی، بے شک خدا نے ہر ماں باپ کی عظمت قرار دی ہے، اُن کے حقوق کی زائد سے زائد نگہداشت کی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ماں باپ کا فرموں تو وہ اس منزلت کے مستحق نہیں ہیں جس منزلت کا استحقاق ان ماں باپ کو ہے جو مسلم ہیں۔ اور مسلم سے زائد وہ مستحق ہیں جو مومن۔ اور مومن سے زائد اُن کی عظمت و احترام ہے جو متقی یعنی جس قدر اُن کی عزت و جلالت خدا کے نزدیک بلند ہوتی جائے گی اُسی قدر اولاد پر اُن کا احترام و عزت و فرماں برداری زائد قوی اور فرض ہوتی جائے گی۔ اور یہ مسلّم ہے کہ کسی انسان کے ماں باپ دونوں اتنے عالی منزلت ہرگز نہ تھے جس قدر حسینؑ کے ماں باپ عالی منزلت تھے۔ اس لیے ہمارا تیسرا امام اس بات کا سب سے زائد مستحق تھا کہ اُس کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے اور اس سب کے بعد کون سی ماں ایسی ہے جس کو بچے کے شکم میں آنے سے رنج ہوا۔ تمنائیں ہوتی ہیں، آرزو ہوتی ہے، منتیں مانی جاتی ہیں کہ

اولاد ہو اور خصوصاً لڑکا، اور پھر عورتوں کے ارمان - لہذا خوشی ہوتی ہے اور بے حد خوشی - کراہت نہیں ہوتی، رنج نہیں ہوتا - یعنی حمل کی گراں باری سے عورت کو زحمت ہوتی ہے، تکلیف ہوتی ہے، کمزوری محسوس ہوتی ہے، وضع حمل کی شدتیں ہوتی ہیں، بے چینی ہوتی ہے مگر کراہت نہیں ہوتی - میری عرض یہ ہے کہ آپ غور فرمائیں کہ رنج اور ہے، تکلیف اور ہے، بے چینی اور ہے، کراہت اور ہے یعنی پسند نہ کرنا - واضح ہو - آپ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس شئے سے کراہت ہے یعنی ہم اسے پسند نہیں کرتے - فلاں شخص نے بہ کراہت منظور کیا یعنی راضی نہ تھا بہ جبر مانا - یہ اور چیز ہے اور تکلیف اور چیز ہے - میں مانتا ہوں کہ عورتوں کو زمانۂ حمل میں بے چینی ہوتی ہے تکلیف ہوتی ہے مگر کراہت نہیں ہوتی کہ بچّہ میرے شکم میں کیوں آیا، وضع حمل کیوں ہوا - لہذا آیت میں لفظ کی تخصیص حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ کُرۡهًا اس انسان کی ماں نے اس بچّے کو بہ کراہت یعنی رنج و غم کے ساتھ شکم میں رکھا - یہ اس کی دلیل ہے کہ یہاں صرف امام حسینؑ کا تذکرہ ہے کیونکہ دنیا میں صرف یہی ایک انسان تھا جس کے مصائب و آلام اس کی ولادت سے قبل انبیاء کو معلوم تھے، مرسلین کو معلوم تھے، نانا کو معلوم تھے، باپ کو معلوم تھے، حد یہ ہے کہ ماں کو معلوم تھے - تمام عالم انسانیت کو اقرار ہے کہ بہ یک وقت پے در پے انتہائی شدت کے ساتھ اپنی کثرت کے اعتبار سے جس قدر مصیبتیں حسینؑ ابن علیؑ پر گزریں اتنے مصائب دنیا کے کسی انسان پر نہیں گزرے - عزیزوں کا ذکر نہیں، دوستوں کا تذکرہ نہیں بلکہ اغیار، دشمن، کافر، مشرک جو بھی توجہ کے ساتھ حسینؑ کے مصائب سُن لیتا ہے وہ رو ہی دیتا ہے اور اگر آنکھ سے آنسو نہ بھی نکلیں تو

غمگین ہو ہی جاتا ہے۔ تو پھر اگر ماں سے بتا دیا جائے کہ جو بچہ تیرے بطن میں ہے اس پر کیا گزرے گی، کون کون سی مصیبتیں پڑیں گی، کس ظلم و ستم سے قتل کیا جائے گا، تو اس ماں کے دل پر کیا گزرے گی، کتنا رنج ہوگا، کس قدر صدمہ ہوگا۔

امینِ وحی نازل ہوئے رسولؐ سے عرض کی "تم اپنی نورِ نظر فاطمہؑ سے بتا دو کہ اس بچے پر یہ ظلم گزریں گے، یوں قتل ہوگا"۔ رسولؐ دل تھام کر بیٹی سے کل واقعہ بیان کرتے ہیں، سیّدہ روتی ہیں اور اس طرح شہادت حسینؑ سے پہلے ہی مجلسِ حسینؑ کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ رسولؐ ارشاد فرماتے ہیں، "اے میری پارۂ جگر! تیرا یہ فرزند مصائب میں تو ضرور مبتلا ہوگا مگر خداوند عالم اس بچے کو امامت دے گا، شہادت دے گا بلکہ اس کی نسل میں امامت ودیعت کرے گا"۔ سیّدہؑ عرض کرتی ہیں کہ بابا! میں اپنے رب کی رضا پر شاکر ہوں، راضی ہوں۔ آپ فرمائیے کہ جس کا بچہ بطن مادر سے آواز دے یَا اُمَّاہُ! اَنَا الْغَرِیْبُ اَنَا الشَّھِیْدُ اَنَا الْعَطْشَانُ مادرِ گرامی! میں غریب ہوں، شہید ہوں، پیاسا ہوں"۔ اس ماں کے دل پر کیا گزرے گی جس بچے کا یہ عالم تھا کہ جناب زکریاؑ نے درگاہِ باری میں التجا کی کہ مجھ کو اسمائے پنجتنؑ تعلیم کئے جائیں۔ دعا قبول ہوئی اسماء تعلیم کیے گئے۔ جب جناب زکریاؑ کسی تکلیف یا مصیبت میں مبتلا ہوتے تھے تو اسماء پنجتنؑ زبان پر جاری کرتے تھے چار نام تو رنج و غم اور مصیبت کو دور کرتے تھے مگر جب حسینؑ کا نام زبان پر آتا تھا تو جناب زکریاؑ کے دل پر چوٹ سی لگتی تھی، رگریہ گلوگیر ہوتا تھا بے اختیار آنسو بہنے لگتے تھے۔ عرض کی درگاہِ باری میں کہ "پیدا کرنے والے اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ حسینؑ کا نام آتے ہی میرا دل

کیوں بے چین ہو جاتا ہے"۔ وحی ہوئی کہ "اے زکریا! یہ میرے حبیب کا نواسہ بڑی سخت مصیبت کے بعد پیاس کے عالم میں بہ ظلم و ستم قتل کیا جائے گا" یہ سُن کر جناب زکریاؑ کو صدمہ ہوا تین دن تک رویا کیے، آب و طعام ترک کر دیا، ہلنا جُلنا چھوڑ دیا۔

جناب زکریاؑ نہ حسینؑ ابن علیؑ کے آباء میں تھے نہ اجداد میں تھے مگر اس کے بعد خبر مصائب سُن کر یہ حالت ہوئی تو اُس ماں کے رنج و غم کو کون بیان کر سکتا ہے جو جانتی ہو کہ میرا بچہ کن مصائب میں مبتلا ہوگا۔ دُنیا کا رسم ہے ہر ماں کی یہی حالت ہے کہ زمانۂ حمل میں زحمتیں ہوئیں، تکلیفیں ہوئیں، وقت وضع حمل بے چینی ہوئی، مصیبت گزری، مگر جب بچہ پیدا ہوا اور ماں کی نظر ان مصائب کے نتیجے اور اپنی زحمتوں کے ثمر پر پڑی تو دل خوش ہو گیا، تمام تکلیفیں کافور ہو گئیں، تمام اعزا خوش ہو گئے۔ مگر یہ صرف حسینؑ ابن علیؑ تھے کہ اسماء ناقل ہے کہ بچے کی ولادت ہوئی رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسماء لاؤ میرے بچے کو مجھے دو۔ اسماء نے تعمیل ارشاد کی، بچے کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر رسولؐ کی گود میں دے دیا۔ رسولؐ نے داہنے کان میں اذان کہی، بائیں کان میں اقامت کہی اور رونے لگے۔ اسماء نے گھبرا کر پوچھا "یا رسول اللہ! یہ تو خوشی کا مقام ہے آپ روئے کیوں؟" رسولؐ نے فرمایا، "اسماء کیا کہوں، یہ میرا بچہ قتل کیا جائے گا، خدا اُس پر لعنت کرے جو میرے بچے کو قتل کرے گا"۔

اسماء کہتی ہیں کہ حسینؑ کی ولادت کو چھ دن گزرے ساتواں دن آیا، رسولؐ تشریف لائے، تمام دُنیا میں چھٹی میں خوشیاں ہوتی ہیں، عقیقے کے دن مبارک بادیں گزرتی ہیں مگر رسولؐ نے یہ کچھ نہ کیا، عقیقے میں گوسفند ذبح کرایا، سر کے بال

منڈواے، بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ کی حسینؑ ابن علیؑ کے سر مبارک پر خوشبو ملی، اور بچے کو اپنی گود میں بٹھا کر رونے لگے۔ یا تو اس لیے کہ ذبح گوسفند نے دل کے زخم تازہ کر دیے اور یا حسینؑ کے سر مبارک پر خوشبو ملتے ملتے وہ وقت یاد آگیا جب یہی سر تلواروں سے اور پتھروں سے زخمی ہو گا۔

عزادارانِ حسینؑ! یقیناً ہر وہ مجاہد جو میدانِ جنگ میں آیا زخمی ضرور ہوا اور بہت سے ایسے بھی شہید راہِ خدا ہوئے جن کے سر بھی زخمی تھے، مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کوئی شہید ان میں ایسا بھی تھا جس کا سر بعد شہادت زخمی ہوا ہو۔ یہ مصیبت بھی بس حسینؑ ہی سے مخصوص ہو گئی تھی۔

اسیرانِ اہلبیتؑ کا قافلہ بازار سے گزر رہا ہے، آگے آگے نیزوں پر شہیدوں کے سر ہیں پیچھے پیچھے سیدانیاں برہنہ پشت کے ناقوں پر سوار، ایک ملعونہ اپنے کوٹھے پر بیٹھی ہوئی اسیروں کا تماشہ دیکھ رہی ہے جب سرِ حسینؑ اُس کے مکان کے برآمدے کے نیچے گزرا تو اُس نے بڑا غضب کیا ایک پتھر اُٹھایا اور ایسا ظلم کیا کہ پیشانیٔ مبارک خون سے رنگین ہو گئی۔ زینبؑ نے جب یہ منظر دیکھا تڑپ گئیں اور فرمایا کہ ہائے میری ماں کے چاند! ابھی تو تو کمال کو بھی نہ پہنچا تھا کہ گہن لگ گیا۔

عزادارانِ حسینؑ! یہی ایک موقع نہ تھا جب سرِ حسینؑ کی بے حرمتی کی گئی۔ بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ یزید میں بھی برابر سرِ حسینؑ پر ظلم ہوتا رہا۔ میں اس وقت آپ کے سامنے صرف دو واقعے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا تو یہ ہے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت رانڈوں کا لٹا ہوا قافلہ دربار میں آیا ہے تو یزید ملعون تختِ حکومت پر تھا۔ امراء و سفراء

سونے چاندی کی کرسیوں پر بیٹھے مگر اہلبیتِ حسینؑ کے لیے سوائے زمین کے کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ اس عالم میں یزید نے حکم دیا اور وہ طشتِ طلا لایا گیا جس میں سرِ حسینؑ رکھا ہوا تھا۔ عزادارو! اس ملعون کے ہاتھ میں چھڑی تھی، ابرا(دغضب) کیا، حسینؑ کے لب و دنداں سے بے ادبی کرنے لگا۔ کہاں حسینؑ کے پاک لب اور کہاں یزیدِ نجس کی چھڑی!

صحابیِ پیغمبرؐ سمرہ بن جنادہ تڑپ کر اُٹھے "اے یزید! چھڑی ہٹا لے۔ میں نے دربارِ رسولؐ کو یہی ہونٹ پیار و محبت سے چومتے ہوئے دیکھا ہے"! یزید نے جواب دیا کہ "تم اگر صحابیِ پیغمبرؐ نہ ہوتے تو ابھی قتل کروا دیتا" سمرہ نے جواب دیا "وائے ہو یزید تجھ پر! ارے صحابی کا اتنا خیال اور رسولؐ کے نواسے کو ذبح کر ڈالا گیا!" یزید نے ان کو دربار سے نکلوا دیا۔

عزادارو! اب تم ہی انصاف کرو کہ جب صحابیِ پیغمبرؐ غیر ہو کر یہ ظلم نہ دیکھ سکا تو زینبؑ نے کیونکر دیکھا ہوگا، اُمِّ کلثومؑ نے کیونکر صبر کیا ہوگا، سکینہؑ کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی؟

بہرحال یہ ایک موقع تھا جب سرِ حسینؑ کی بے حرمتی کی گئی۔ اور دوسرا موقع وہ جب سفیرِ روم کے سامنے سرِ حسینؑ پر ظلم کیا گیا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید کا دستور یہ تھا کہ وہ برابر اپنے دربار میں سرِ حسینؑ طلب کرتا تھا اور قید خانے سے سیدِ سجادؑ کو بھی بلوا لیتا تھا۔ سرِ حسینؑ اور مجبور و بے کس امام کے سامنے شراب کا دَور چلتا تھا اور یہ ملعون سیدِ سجادؑ کے دل کو دُکھانے کے لیے بار بار لب و دندانِ حسینؑ سے گستاخی کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اُس کے دربار میں سفیرِ روم بھی آیا ہوا تھا،

اُس نے جب یہ منظر دیکھا تو پوچھا۔ "یزید، یہ کس کا سر ہے؟" یزید نے جواب دیا "حسینؑ ابن فاطمہؑ کا۔" سفیر نے دریافت کیا "کون فاطمہؑ"؟ یزید نے کہا "رسولؐ کی بیٹی"۔ بس یہ سُننا تھا کہ سفیر ردم بے چین ہو گیا اور کہا کہ "اے یزید! وائے ہو تجھ پر اور تیرے دین پر۔ میں داؤدؑ نبی کی نسل میں ہوں اور پشتہا پشت کا فاصلہ ہے مگر آج بھی لوگ میری خاکِ قدم اپنے سروں پر رکھتے ہیں اور تو نے اپنے نبیؐ کے نواسے کو شہید کر ڈالا!" یزید کو غصہ آیا اور حکم قتل دیا۔ سفیر نے کہا "یزید! قتل سے نہیں روکتا، مگر میرا خواب سُن لے۔ اے یزید! آج ہی رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ محمدؐ مصطفےٰ مجھے جنّت کی بشارت دے رہے ہیں، مجھے بڑا تعجب تھا کہ مسلمانوں کا پیغمبر اور مجھے جنّت کی بشارت دے۔ لیکن اب تعبیر ملی۔ یہ کہہ کر کلمہ زبان پر جاری کیا اور مسلمان ہوا۔ اس کے بعد آگے بڑھا، سرِ سیّد الشہدا اُٹھایا، سینے سے لگایا، مُنہ پر مُنہ رکھا۔ جلّاد کی تلوار چلی تو زبان سے کہہ رہا تھا کہ "فرزندِ رسولؐ! گواہ رہیے گا آپ کی محبت میں قتل ہو رہا ہوں"۔

مجلسِ سوئم

أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ اللَّعِينِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا اَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِينَ وَاَهْلِبَيْتِهِ الطَّاهِرِينَ الْمَعْصُومِينَ — اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِينُ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِينَ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

واقعاتِ ماضی و مستقبل کا عالم، اپنے انبیاء کو ہر واقعے کی خبر دینے والا، قرآن کی زبانی، خاتم النبیینؐ سے حسینؑ ابن علیؑ کی سوانح عمری بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ "ہم نے اس حقیقی انسان کو وصیّت کر دی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیکی کرے۔ کون سے ماں باپ؟ وہ بے مثل ماں باپ جیسے تمام مخلوقاتِ عالم میں کسی انسان کو

نہیں ملے - یعنی فاطمہؑ سی ماں اور علیؑ سا باپ - بطن ایسا کہ جواب نہیں، صُلب

ایسا جس کی نظیر نہیں، وہ سیّدۂ زنانِ عالم یہ سیّدالاوصیاء - وہ مریم سے افضل

یہ عیسیٰ سے بہتر - وہ بنت رسولؐ - یہ وصیِ رسولؐ - وہ رسول کی بیٹی، یہ رسولؐ کے

بھائی - وہ عالمہ، محدثہ، زکیہ، طاہرہ، راضیہ، مرضیہ - یہ عالم علوم اولین

آخرین، اُستادِ جبرئیلِ امین، پاک و پاکیزہ، طیب وطاہر علیؑ مرتضیٰ -

دُنیا کی روایتیں بتاتی ہیں کہ جب سیّدہ تشریف لاتی تھیں تو پیغمبر اپنی

جگہ بٹھاتے تھے - شاید اس میں اشارہ یہ تھا کہ عورتوں کے واسطے سیرۃ کی تعلیم

سیّدہ سے متعلق ہے وہ اس منزل میں نائب ہیں - مگر علیؑ وہ تھے کہ جن کو رسولؐ

نے خلافت دے کے اپنی جگہ پر ہمیشہ کے واسطے بٹھا دیا -

بلکہ حسینؑ کے ماں باپ پر کیا موقوف تمام قبیلہ، تمام خاندان، کُل رشتہ دا

بے مثل جن کا کوئی جواب نہیں - ہم نہیں، دوستوں کا ذکر نہیں، حسینؑ کے ماں باپ

اور اُن کا خاندان وہ تھا جن کی فضیلت کے اعدا معترف، دشمن کی زبانوں پر مدح و

ثنا - خولی اور بشر، امام حسینؑ کا سرِ مُبارک لے کے ابن زیاد کے دربار میں آئے

فرزندِ رسولؐ کا سر پیش کیا اور مقام فخر میں کہتے ہیں کہ " اے امیر اِس نے اس

شخص کو تیری رضا کے واسطے قتل کر دیا جس کے ماں باپ تمام دنیا سے افضل و

بہتر تھے " اور ماں باپ ہی پر کیا موقوف اگر تمام عالم کے خاندان اور نسب حسینؑ ابن

علیؑ کے مقابلے میں پیش کیے جائیں تو حسینؑ کا خاندان سب سے بہتر نکلے گا -

یہ نہ سمجھیے گا کہ حسینؑ کے صرف باپ افضلِ اولادِ آدم، صرف ماں اشرفِ مخلوقا

عالم - جی نہیں! دُنیا بتا دے کہ حسینؑ کے بھائی کا کوئی جواب تھا، حسینؑ کی بہن کا

کوئی مثل تھا، حسینؑ کے نانا کا کوئی نظیر تھا، حسینؑ کی نانی کا کوئی مدِّ مقابل تھا، حسینؑ کے چچا جناب جعفر کا کوئی ہم پلہ تھا، حسینؑ کی اولاد کا کوئی ہمسر تھا؟ جانے دیجئے ان سب حضرات کو، یہ بتائیے کہ حسینؑ کے دادا ابوطالب کا کوئی مثل تھا، جناب عبدالمطلب کا کوئی جواب تھا، جناب ہاشم کا کوئی مثل تھا؟ لاحول ولا قوت!

دُنیا لاکھ فضیلت کو دبانا چاہے، چھپانا چاہے، منزلتوں کو گھٹانا چاہے مگر فضیلت بھی کہیں دبتی، چھپتی ہے؟ جس چراغ کو خدا روشن کرے وہ چراغ بھی کہیں بُجھتا ہے؟ ابر آجائے مگر آفتاب آفتاب رہے گا، دُنیا گردش کرے مگر خورشید خورشید رہے گا۔ رات بحد تاریک ہو جائے مگر چاند کے دامن سے چھو نہ جائے گی رسّا اس کے مقابلے میں ہزار چراغ جلایئے مگر نور کی دلکشی نگاہیں موڑتی ہی رہے گی۔

حسینؑ کے واسطے بھی تمام دُنیا نے کوشش کی، تمام عالم نے زور لگایا کہ حسینؑ کی فضیلت پھیلنے نہ پائے، اُبھرنے نہ پائے۔ یہ کہہ دیا کہ "وہ شہید ہی نہ ہوئے کسی طرف چلے گئے۔ اور اگر شہید ہوئے بھی تو فضیلت کیا؟ فضیلت اُن شہدا میں ہے جو کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوں لیکن جس کو مسلمان قتل کریں اس میں کوئی عظمت نہیں۔ اور اگر ہو بھی عظمت تو جناب حمزہؑ تمام شہدا کے سردار ہیں حسینؑ کو سیّد الشہدا کیوں کہا۔ اچھا اگر شہید بھی ہوئے تو رونے سے کیا ملے گا؟ یہ مجلسیں کیوں؟ یہ تذکرۂ مصائب کیا؟" حد یہ ہے کہ اس سے بھی انکار کہ حسینؑ کی ماں سب سے بہتر۔ اس سے بھی انکار کہ حسینؑ کے باپ سب سے افضل۔ اس سے بھی انکار کہ حسینؑ فرزندِ رسولؐ۔ اور آگے بڑھیے تو معاذ اللہ ابوطالب کافر، عبدالمطلب کافر، ہاشم کافر العیاذ باللہ! ان کافروں کو سب ہی کافر نظر آئے کہ پورے خاندان کو کفر کا فتویٰ دے دیا۔

ابھی حدِ عداوت یہ ہے کہ جو آیت سراسر نامۂ کلام ہے، اور دُنیائے انصاف جس کے متعلق کہہ سکتی تو دو باتیں۔ پہلے یہ کہ آیت میں کسی خاص شخص کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے یہ کہ واقعات، صفات، حالات اور معصومینؑ کی تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت حسینؑ کی شان میں ہے۔ مگر لوگوں کی حسینؑ سے انتہائی عداوت یہ تھی کہ آیت کو بابِ اہلبیتؑ سے موڑ کر اُن دروازوں پر پہنچا دیا جہاں سے آیت کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ روگردانی کیے نظر آتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے مزبلے پر ہیرا، غلاظت میں موتی، ظلمت میں نور، شب کے سیاہ دامن پر ستاروں کی آیتیں، یا کفر کے پہلو میں اسلام، نفاق سے زانو بہ زانو ایمان!! کہاں آیتِ قرآن اور کہاں وہ در جہاں آیت کو گھسیٹ کر پہنچایا گیا!! ربط ہو یا نہ ہو، تعلق ہو یا نہ ہو، ٹکڑا لگتا ہو یا نہ لگتا ہو، آیت کے خط و خال مطابق ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، تصویر سے تصویر ملتی ہو یا نہ ملتی ہو مگر کہہ دیا کہ اس آیت میں حسینؑ کا ذکر نہیں بلکہ ایک دوسرے صاحب تھے۔ کون صاحب؟ کن بزرگ کی طرف موڑی گئی؟ کہاں کا پیوند کہاں لگایا گیا؟ خدا کی پناہ! نام لینے کو دل نہیں چاہتا، طبیعت جھکتی ہی نہیں کہ آیت حسینؑ ابن علیؑ کے علاوہ کسی اور کی شان میں ہے۔

میں سچ عرض کرتا ہوں اور خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ مجھ کو تو اس کا وہم بھی نہ تھا کہ کسی مسلمان نے اس آیت کو رسولؐ کے چھوٹے نواسے سے ہٹا کر کسی اور کے گھر میں اُتارنے کی کوشش کی ہوگی، مصداقِ آیت میں کسی دوسرے کا نام لیا ہوگا۔ مگر تاہم خیال ہوا کہ لاؤ ذرا فخر الدین رازی کی تفسیر بھی دیکھ لوں شاید کوئی بات ایسی مل جائے جو بیان کرنے کے قابل ہو۔ چنانچہ چھبیسواں ۲۶ پارہ کھول کر تفسیر دیکھی تو میرے تعجب کی

حد نہ رہی۔ پہلے تو رازی صاحب نے عام طریقے پر تفسیر بیان کی کہ انسان کی یہ حالت ہے یوں حمل ہوتا ہے، یوں ولادت ہوتی ہے، یہ صورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کر دیا کہ "اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم مدتِ حمل چھ ماہ ہے۔ یعنی عموماً بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ آٹھ ماہ میں صحیح و سالم بچہ پیدا ہو یا سات ماہ میں پیدا ہو۔ بلکہ اس آیت سے یہ بھی نکلتا ہے کہ کامل بچہ جس کے ہاتھ، پیر، کان، ناک میں کوئی کمی نہ ہو چھ مہینے میں پیدا ہو۔ اس کی دلیل ہے کہ خلیفۂ ثانی کے دربار میں ایک عورت پیش کی گئی جس کے یہاں چھ مہینے میں بچہ پیدا ہوا تھا۔ دربار سے حکم ہوا کہ "اس کو سنگسار کر دو"۔ علیؑ کو خبر ہوئی، آپ دربار میں تشریف لائے اور فرمایا کہ "تم نے غلط حکم دیا یہ عورت سنگسار کرنے کی مستحق نہیں"۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ "یا علیؑ! اس کے شوہر کے تعلق کو صرف چھ ماہ گزرے ہیں اور بچہ کامل پیدا ہوا تو یقیناً یہ اُس کے شوہر کا نہیں ہے کسی سے اس نے زنا کی ہے"۔ امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا کہ چھ ماہ میں بچہ کامل ہونا زنا کی دلیل نہیں ہے، میں تمہارے سامنے قرآن سے دلیل پیش کرتا ہوں کہ چھ ماہ کا بچہ کامل ہو سکتا ہے پڑھو آیت وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ "عورتوں کو چاہیے کہ بچوں کو دو برس کامل دودھ پلائیں"۔ اب تم سمجھے کہ دودھ پلانے کی مدت دو برس قرار دی ہے۔ اچھا اب دوسری آیت سنو وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُونَ شَهْرًا "ایک انسان ایسا بھی ہے جس کے حمل اور دودھ پلانے دونوں کی مدت ملا کے تیس مہینے ہوئے"۔

امیر المومنین فرماتے ہیں کہ "آیت نے اس کی تصریح کر دی کہ ایک انسان صحیح و سالم اور بالکل کامل پیدا ہوا، زندہ رہا، چالیس برس کی عمر تک پہنچا مگر اس انسان

کا حمل اور دودھ بڑھائی سب تیس۳۰ ماہ میں ختم ہوئی تو اب بنا بر حکم عقلی آیت کے دو۲ برس یعنی چوبیس۲۴ مہینے تو دودھ پلانے کے نکل گئے اور تیس ماہ میں چھ مہینے باقی بچے جو حمل کے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ انسان کل چھ مہینے بطنِ مادر میں رہا۔ لہذا جب قرآن نے بتادیا کہ کسی انسان کی مدتِ حمل چھ ماہ ہو سکتی ہے تو پھر اس عورت کے واسطے سنگسار کرنے کا حکم غلط ہے۔" خلیفۂ ثانی نے حکم بدلا، عورت آزاد کی گئی اور شیعہ سنی کو مسلم ہے کہ اسی دن سے یہ حکم تمام مسلمانوں میں مسلم ہو گیا کہ اگر کوئی ثبوت زنا کا نہ ہو تو محض چھ ماہ میں بچہ پیدا ہونا زنا کا ثبوت نہیں ہے۔ فخر الدین رازی نے بھی یہ حکم تسلیم کیا۔ خلیفۂ ثانی کا حکم دینا اپنی کتاب میں لکھا، علیؑ کا ٹوکنا لکھا۔ اور اس دن سے تمام مسلمانوں کا اس حکم کو مان لینا لکھا۔

ان سب باتوں کے بعد پھر خود ہی فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ "حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور آپ نے بھی عورت کے سنگسار کرنے کا حکم دیا مگر ابن عباس نے ٹوکا اور آیت پڑھ کر سنائی اس وقت عورت کی جان بچی۔" اب ذرا انصاف سے دونوں واقعوں کو ملائیے خلیفۂ ثانی نے حکم دیا علیؑ نے دلیل سمجھا کے روکا۔ مگر اس کے بعد خلیفۂ ثالث نے پھر وہی غلط حکم دیا اور ابن عباس نے رد کیا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرنے سے ہر انسان یہ نتیجہ نکال ہی لے گا کہ دونوں خلفاء میں اتنا علم نہ تھا کہ صحیح حکم نکال سکیں، نہ اتنی قابلیت تھی کہ قرآن کے آیات سے احکامِ خدا سمجھ سکیں۔ بلکہ خلیفۂ ثالث کی سمجھ میں تو علیؑ کے بتا دینے کے بعد بھی نہ آیا اور علیؑ کے شاگرد ابن عباس کو ٹوکنے کی ضرورت ہوئی اب آپ ہی فرمائیں کہ ایک طرف علیؑ دوسری طرف خلیفۂ ثانی، ان دونوں میں کون مستحق خلافتِ رسولؐ تھا

اور اس سے زائد یہ کہ ایک طرف عثمان اور ان کے مقابل ہیں ابن عباس۔ وہ رسولؐ کی خلافت کے مدعی اور یہ علیؑ کے شاگرد، وہ حکم میں غلطی کرتے ہیں ابن عباس ٹوکتے ہیں اور صحیح حکم بتاتے ہیں۔ تو فرمائیے کہ علی کا شاگرد خلیفۂ ثالث سے بہتر ہوا یا نہیں؟ تو جس کے شاگرد خلیفہ سے بہتر وہ مستحق خلافت رسولؐ تھا یا وہ جن کو شرعی حکم بھی نہ معلوم تھے؟ یہ کھلا ہوا ثبوت اس کا کہ علیؑ پر کتنا بڑا ظلم ہوا۔

مگر اس مقام پر ایک بات یہ بھی کہتا چلوں کہ ہماری روایتوں اور تاریخوں میں ہے کہ امام حسینؑ اور جناب یحییٰ، یا امام حسینؑ اور جناب عیسیٰ دو بچوں کے علاوہ عالم میں کوئی بچہ چھ ماہ بطن مادر میں رہ کر پیدا نہیں ہوا جو زندہ رہا ہو۔ لہٰذا اعتراض ہو سکتا ہے کہ تم تو کہتے ہو کہ دو بچوں کے علاوہ دنیا میں کوئی بچہ چھ ماہ کا پیدا نہیں ہوا مگر خود تم کو اقرار ہے کہ کم از کم ایک بچہ خلیفۂ ثانی کے دور میں اور دوسرا بچہ خلیفۂ ثالث کے دور میں ایسا پیدا ہوا جس کی مدت حمل صرف چھ ماہ تھی اور پھر وہ بچہ کامل تھا تو دو کیسے چار بچے تو یہی ہو گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ کوئی بچہ چھ ماہ میں کامل پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ چھ ماہ میں پیدا ہونا ممکن ہے مگر ایسا بچہ زندہ نہیں رہتا۔ جیسے آپ کے یہاں مشہور ہے اور تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ساتماہ کا بچہ پیدا ہو کے زندہ رہتا ہے جیسے بہت سے ستواںسے زندہ رہے لیکن آٹھ ماہ کا بچہ جسے اٹھواںسا کہتے ہیں زندہ نہیں رہتا، تو پیدا ہونا نہ ہونا اور بات ہے اور زندہ رہنا نہ رہنا دوسری بات ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ چھ ماہ میں بچہ پیدا نہیں ہوتا، پیدا ہوتا ہے اور ضرور پیدا ہوتا ہے مگر زندہ نہیں رہتا، البتہ اگر زندہ رہے تو صرف دو بچے۔

اب جب آپ ہمارا دعویٰ سمجھ گئے تو فیصلۂ ثانی اور ثالث کے زمانے میں ایسی

عورتوں کا آنا جن کے یہاں چھ ماہ میں بچہ پیدا ہوا ہو ہمارے دعوے کی رد نہیں کرتا، کیوں کہ سنی شیعہ کسی شخص نے یہ نہیں لکھا کہ اُن دونوں کے بچے زندہ بھی رہے۔ تو جب زندہ رہنے کا کوئی ثبوت نہیں تو صرف پیدا ہونے سے ہمارے دعوے کی رد نہیں ہوسکتی۔

بہرحال فخرالدین رازی یہ تمام باتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "کہا جاتا ہے کہ حمل کے زمانے تو مختلف ہوا کرتے ہیں کوئی چھ ماہ میں، کوئی سات ماہ میں کوئی آٹھ نو ماہ میں بلکہ دس گیارہ ماہ میں پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان چھ ماہ میں پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا آیت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کا تذکرہ نہیں بلکہ کسی خاص انسان کا تذکرہ ہے پس ممکن ہے یہ آیت ابوبکر کی شان میں ہو، کیونکہ آپ چھ ماہ میں پیدا ہوئے۔ دو برس ماں کا دودھ پیا۔ چالیس برس کے قریب پہنچے تو مسلمان ہوئے، اسی سن میں آپ نے دعا فرمائی اور آپ نے اس نعمت کا شکریہ ادا کیا کہ آپ مسلمان ہوئے اور چونکہ آپ کے ماں باپ بھی مسلمان ہوگئے تھے لہذا آپ نے اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کیا، آپ نے دعا کی کہ ہم کو نیک عمل کی توفیق دے تو وہ نیک عمل یہ تھا کہ آپ نے کئی غلام خرید کے آزاد کیے۔ اور یوں تو آپ نے تمام عمر نیکیاں ہی نیکیاں کیں۔ آپ نے یہ بھی دعا فرمائی کہ میری قرابت کو نیک کر تو آپ کے کل لڑکے لڑکیاں مسلمان ہوگئیں۔ ہو نہ ہو آپ ہی ہیں"

دیکھ لی آپ نے زبردستی!! ضد ہے دُنیا کو کہ جس حدیث میں آلِ رسولؐ کا ذکر ہوگا اُس کو بدلیں گے ضرور! جس آیت میں اولادِ رسول کی تعریف ہوگی اُسے موڑیں گے ضرور! ٹھیک بیٹھے نہ بیٹھے، دروازے پڑتے نہ تھے، نقش و نگار سے مطابق ہو یا

نہ ہو مگر لائیں گے کھینچ تان کے اور اغیار کی طرف ۔ مجال ہے آیت کی کہ نہ آئے۔ قرآن ہمارے ہاتھ میں، زبان ہمارے قبضے میں۔ قلم کے اوپر پورا قبضہ، راوی ہمارے بس کے، مؤرخ ہماری قوم کے، شاہی ہمارے ہاتھ میں، تعداد کی کثرت ہماری طرف، دولت کے ڈھیر ہمارے پاس، پھر کیوں نہ آئے گی آیت؟ خوشی سے نہ آئے گی تو بہ جبر آئے گی۔ مگر چلنا پڑے گا آیت کو اور اُسی طرف ۔

میں کیا آپ کو بھی کبھی اس کا وہم نہ ہوا ہوگا کہ ایسی صاف آیت یوں مکدر کی جائے گی اور اتنے صریح واقعات یوں توڑ مروڑ کے کذب صریح کا ثبوت دیا جائے گا۔ مگر کسی کے کہنے سے کیا اور آیت کے پلٹانے سے کیا، جاہل دھوکا کھائیں، نافہم بہکانے میں آئیں، جن کے دل میں ایمان کی چمک نہ ہو وہ کسی دوسرے کی طرف جائیں۔ مگر ایمان والے، اور دنیا کی فریب دہی سے واقف کہیں ایسے جال میں آسکتے ہیں۔

سُنئے! خدا ارشاد کرتا ہے کہ ہم نے انسان کو وصیت کی، تو پہلے تو کوئی انسان ہونا ہی ثابت کرے۔ پھر آگے بڑھیے اور اُسے بھی چھوڑیے، ارشاد ہوتا ہے حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا "جب وہ انسان شکم مادر میں آیا تو حمل کا زمانہ رنج و الم میں گزرا" تو فرمائیے خلیفۂ اوّل کی ماں کو کاہے کا غم تھا؟ یہ غم تھا کہ یہ لڑکا مسلمان ہو جائے گا، اس کا غم تھا کہ رسولؐ کی مسند پر بیٹھ جائے گا، اس کا صدمہ تھا کہ حاکم وقت ہوگا!! آخر کون سی بات تھی جس کا صدمہ تھا؟ حسینؑ کی والدہ کو رنج و غم تھا اور ہونا ہی چاہیے تھا کہ یہ بچہ مظلوم ہے، غریب ہے، شہید ہے۔ مگر خلیفۂ اوّل کی ماں کو کاہے کا صدمہ تھا؟ اور پھر جب حسینؑ بطن مادر میں تھے تو رسولؐ موجود تھے جن کو وحی کے ذریعہ سے سب کچھ معلوم ہوا اور رسولؐ نے سیّدہؑ سے بتایا لیکن جب یہ بزرگ ماں کے پیٹ میں آئے تو

جاہلیت کا زمانہ، نبی سے دنیا خالی، پھر ان کی ماں کو کیونکر معلوم ہوا کہ یہ بچہ کیسا ہے کہ اس کا غم لے کے بیٹھتیں۔

اس کے علاوہ آیت میں اُس انسان کا ذکر ہے جو بطنِ مادر میں چھ مہینے رہا۔ آپ نے کہہ تو دیا کہ یہ حضرت بھی چھ مہینے ماں کے پیٹ میں رہے مگر جاہلیت کے زمانے میں کون سی تاریخ تھی جس نے آپ کو اس کا پتہ بتایا۔ آپ کو اپنے خلفاء کی تاریخ ولادت تک تو معلوم نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ بطنِ مادر میں چھ مہینے قیام فرمایا!! پھر وضع حمل کے وقت ان کی ماں کو کس بات کا غم تھا؟ اور آگے بڑھیے تو ارشاد فرمائیے وہ کون سا نیک عمل تھا جس کی دعا کی تھی؟ یہی نا کہ غلام خرید کے آزاد کیے۔ یہ بڑا نیک عمل ہو گیا جو کسی نے کیا ہی نہیں!! ان بزرگ نے تو زائد سے زائد "نو" غلام خرید کے آزاد کیے اور علیؑ نے تو ایک ہزار غلام خریدے اور آزاد کیے ـــ کہہ دیا علامہ رازی نے کہ تمام عمر نیکیاں ہی کیا کیے" بالکل درست۔ ہر میدان سے فرار، بڑی نیکی۔ غار کا گریہ اور لاتحزن کی آواز، دوسری نیکی! فدک کا غصب اور سیدہؑ کے مصائب، علیؑ کے دروازے پر لکڑیاں اور گلے میں رسی!! خدا کی پناہ، ان نیکیوں کی حد ہی نہیں۔

اولاد کا صالح ہونا۔ اس کا جواب صرف اتنا کہ "سب مسلمان"۔ اگر صالح کے یہی معنی ہیں تو کون سا مسلمان ایسا ہے جس کے حق میں یہ دعا قبول نہ ہوئی ہو۔ سب کے بچے مسلمان لہٰذا ہر ایک کے واسطے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اولاد صالح۔ ہاں اگر ان بزرگ کی اولاد میں کوئی صالح کہا جا سکتا ہے تو محمد ابن ابی بکر۔ مگر قیامت یہ ہے کہ اس غریب کو آپ صالح کہہ ہی نہیں سکتے۔ ہم تو کہیں گے کہ بڑا نیک، بڑا متقی، بڑا سعید، بہت صالح، مگر آپ فرمائیے کہ محمد ابن ابی بکر صالح تھے یا نہیں؟ اگر آپ نے کہا کہ نہیں محمد ابن ابی بکر صالح نہ تھے،

نیک نہ تھے تو آپ کا یہ کہنا غلط کہ "ابوبکر کی تمام اولاد نیک و صالح" اور اگر آپ نے اقرار کیا کہ محمد ابن ابی بکر صالح تو آپ کا مذہب غائب، کیونکہ محمد خلیفۂ ثالث کے قاتل تھے اور قاتل مقتول دونوں صالح ہرگز نہیں ہو سکتے۔

موڑیے آیت کو اور ہزار طرح سے موڑیے مگر ایک ایک لفظ پکار دے گی کہ میں ان بزرگ کے واسطے نہیں۔ میں تو اس کی مدح کر رہی ہوں جس کا باپ محض مسلمان ہی نہیں بلکہ مومن، بلکہ متقی، بلکہ معصوم، بلکہ امیر المومنین یعسوب الدین، سید العرب امام الصالحین بلکہ قرآن کی زبان میں "صالح المومنین"۔ آیت اُس بچے کی مدح کر رہی ہے جو انسان حقیقی، محسن عالم انسانیت، خدا کی طرف سے وصایت کا حامل۔ آیت تو اُس ماں کا ذکر کر رہی ہے جو اِنسیہ حوریٰ، مریم کبریٰ، جانِ رسولؐ، مومنہ کاملہ، صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہرا۔

ذکر ہے آیت میں اور محض اُس انسان کا جس کا حال سن کے آدمؑ روئے، نوحؑ نے نوحہ کیا، ابراہیمؑ کو صدمہ ہوا، موسیٰؑ نے غم کیا، عیسیٰؑ کو رنج ہوا، اسمٰعیلؑ روئے، تمام انبیاء روئے، خاتم النبیینؐ ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ روئے، سیدہؑ کو صدمہ ہوا، حمل کے زمانے میں بھی، وضع حمل کے وقت بھی۔ وہ انسان تھا جس کی ولادت کے وقت جو ملک آیا اُس نے رسولؐ کو مبارکباد دی اور اُسی کے ساتھ تعزیت بھی ادا کی۔ یہی انسان جب چالیس برس کا ہوا تو اُس نے دعا کی اور وہ دعا جو انبیاء کے علاوہ کسی دوسرے کی زبان پر جاری نہ ہوئی۔ ارشاد ہے آیت میں قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ اُس انسان نے درگاہِ باری میں عرض کی کہ "پروردگار! مجھ کو توفیق دے میری مدد کر کہ میں ان نعمتوں کا

شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھ کو عطا کیں اور اُن نعمتوں کا بھی جو تو نے میرے ماں باپ کو دیں اور مجھ کو یہ بھی توفیق دے کہ میں کوئی نیک کام ایسا کروں جس سے تو راضی ہو جائے اور میری اولاد میں صالح قرار دے۔" یہ دُعا ایک تو حسینؑ ابن علیؑ کی زبان پر آئی جس کو خدا نے قرآن میں نقل کیا اور ایک جناب سلیمانؑ کی دعا جو سورۂ نمل میں موجود ہے۔

جناب سلیمانؑ لشکر لے کر چلے وادی النمل میں گزر ہوا، چیونٹیوں کی باتیں سنیں اور ہنس دیے۔ اس مقام پر قرآن ارشاد کرتا ہے فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ۔" جناب سلیمانؑ اس چیونٹی کی باتوں پر ہنس دیے اور درگاہ باری میں دعا کی کہ مجھ کو توفیق دے کہ میں اُن تمام نعمتوں کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو دیں اور وہ نیک کام کروں جو تجھ کو راضی کر دے۔" یہاں تک دونوں دعائیں بالکل ایک، لفظ بہ لفظ ایک۔ ادھر سلیمانؑ اُدھر فخر سلیمانؑ وہ نبی یہ امام، وہ پہلے والوں میں یہ آخر والوں میں۔ ان کی دعا کا بیان بھی قرآن میں موجود اُن کی دُعا بھی قرآن میں مذکور۔ ایک سی لفظیں، ایک سا مطلب، ایک ہی ناقل ایک ہی مدح، مگر ہاں آگے بڑھ کے انداز بدلا، کلام بدلا، نبی و امام کی دُعا میں فرق ہو گیا سلیمانؑ عرض کرتے ہیں وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ" اور مجھ کو اپنے نیک بندوں، عبادِ صالحین میں داخل کر دے صالحین کی صف میں، اُن کے درجے میں پہنچا دے۔" یہ سلیمانؑ کی دعا تھی اور امام حسینؑ فرماتے ہیں وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي" میری اولاد کو میرے واسطے صالح قرار دے میری اولاد میں صالح معین کر۔"

سلیمانؑ کی دُعا کہ مجھ کو صالحین میں شامل کر دے اور حسینؑ کی دُعا کہ صالحین کو میری اولاد میں قرار دے۔ انسان اس بات کی دعا کرتا ہے جو حاصل نہ ہو۔ اس بات کی دُعا نہیں کرتا جو حاصل ہو۔ لہذا کہنا پڑے گا کہ سلیمانؑ نبی تھے، رسول تھے، وسیع سلطنت کے مالک تھے۔ یقیناً عبد صالح تھے مگر کچھ صالحین اتنے بلند تھے جہاں تک سلیمانؑ کی رسائی نہ تھی۔ ان کے منازل کو دیکھ دیکھ کر حضرت سلیمانؑ کی دعا تھی کہ "میرے مالک! مجھ کو ان نیک بندوں میں شامل کر دے" تو معلوم ہوا کہ صالح وہ نہیں جو مسلمان ہو گیا جیسے خلیفۂ اول کی اولاد بلکہ صالح وہ جس کو قرآن صالح کہے، جن میں داخل ہو جانے کی انبیاء دعائیں کریں، جن میں شامل ہونے کے لیے مرسلین کی تمنائیں ہوں۔ ایسے صالح وہی ہو سکتے ہیں جو انبیاء سے بلند، مرسلین سے افضل اور جن کے واسطے حسینؑ ابن علیؑ نے دعا کی کہ ان کو میری اولاد میں قرار دے۔

یہی وہ صالح بندے تھے جن سے سلسلہ مل جانے کی تمنّا ابراہیم نے کی، خدا نے قبول کی دعا اور اُن صالحین کو نسلِ ابراہیم میں قرار دیا۔ انھیں میں شامل ہو جانے کی سلیمانؑ نے تمنّا کی کہ "جہاں یہ ہوں وہاں مجھ کو پہنچا دے۔" اور یہی وہ تھے جو سب کے سب حسینؑ کی اولاد میں قرار دیے گئے۔ جن کے پہلے سیّد السّاجدینؑ دوسرے باقر العلومؑ اولین و آخرین اور تیسرے صادقِ امین۔ اور سب سے آخر قائمِ آلِ یٰسین صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب سے دُنیا خلق ہوئی اور زمین انسانوں سے بسی، اُس وقت سے اس وقت تک اور اب سے قیامت تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں ایسے بشر پیدا ہوئے اور ہوں گے جن کے نیک اعمال نے خدا کو راضی کر دیا۔

وہ اپنے خدا سے خوش رہے اور خدا ان سے خوش رہا۔ سب سے زائد انبیاء و مرسلین
اور ائمہ معصومینؑ جن کے اعمال نے رضا کی سند لے لی خوشنودیٔ خدا کے پروانے حاصل
کر لیے۔ صادقین اور سچ بولنے والوں کے واسطے ارشاد ہے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ
رَضُوْا عَنْهُ "یہ لوگ وہ ہیں جن سے خدا راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے"
دوسرے مقام پر ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو مہاجرین و انصار میں سب سے
پہلے ایمان لائے ارشاد ہوتا ہے کہ وہ خدا سے خوش اور خدا اُن سے خوش، جن
لوگوں نے خلوص اور ایمان کے ساتھ بیعتِ رضوان کی اُن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے
کہ خدا اُن سے راضی ہوا۔ شبِ ہجرت رسولؐ کے بستر پر آرام کرنے والے کے متعلق
ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ غدیرِ خم
میں علیؑ کی ولایت کا اقرار کرنے والوں سے مخاطب ہو کے آیت ارشاد کرتی ہے
رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا "آج میں تمہارے واسطے دین اسلام سے
راضی ہوا۔"

یہ سب وہ لوگ ہیں جن سے خدا راضی، جن کے نیک کام خدا کو پسند، جن کے
اعمالِ صالحہ رضائے خدا کے مستحق۔ مگر میں ایمان والوں سے، مسلمانوں سے بلکہ تمام
دُنیا کے کافروں سے سوال کرتا ہوں کہ کسی ایک انسان کو بھی ایسا موقع ملا کہ وہ ایسا
عمل صالح کر سکے جیسا حسینؑ ابنِ علیؑ نے کیا۔ دکھائے، اور دُنیا میں کوئی ایسا
بہترین کام جس سے رسولؐ راضی، امام راضی، مومن راضی، خدا راضی
رسولؐ کے اعمال کی بلندی خدا کی پناہ، علیؑ کے افعال کی رفعت اعظمۃ للہ
انبیاء اور معصومینؑ کے اعمال تمام دُنیا کے اعمال سے بلند مگر ہے کوئی ایسا عمل

کرنے والا جس کے اعمال کو دیکھ کر مرسلین انگشت بہ دنداں، جن متعجب، ملک حیران، مسلمان معترف، مومن شکر گزار، خدا راضی بلکہ تمام عالم انسانیت ممنونِ کرم۔

دُنیا یک زبان ہے کہ حسینؑ وہ کام کر گئے جو کسی نے نہ کیا۔ ایک ہی وقت میں، ایک ہی حالت میں، ایک ہی میدان میں حسینؑ نے ایمان کی حدیں بھی بتائیں اور ان کا استحکام بھی، عبادت کی عظمت بھی بتائی اور اُس کے انداز بھی۔ صبر کی منزل بھی دکھائی اور آنکھوں میں آنسو بھی، اپنے نانا کی حقیقت کا ثبوت بھی دکھایا اور اُس حقیقت کے مظاہر بھی، انسانیت کی بلند منزل بھی دکھائی اور اس کے صفات کی تعیین بھی، رضائے خدا کی عظمت بھی دکھائی اور راہِ رضا میں ہمت بھی، مظلومیت کی آخری حدیں بھی دکھائیں اور انتہائی مظلومیت کی قوت بھی۔ درسِ اخلاق تھا، عملی تعلیم تھی، خونِ شہدا سے کتابِ انسانیت کی تصنیف تھی جو آج تک عالم کے درس میں داخل۔

صبح عاشور سے عصر تک چند ہی گھنٹے گزرے مگر ان چند گھنٹوں کا ہر لمحہ اور ہر لمحہ کا ہر حصہ ایک کوزہ تھا جس میں دریا بند، ایک قطرہ تھا جس میں سمندر موج زن، ایک ذرہ تھا مگر بنیادِ عالم، ایک نقطہ تھا جس میں کل قرآن کی تفسیر جو تمام دُنیا نے مہینوں میں سکھایا، برسوں میں سکھایا اُس کی عملی تعلیم حسینؑ ابن علیؑ نے چند گھنٹوں میں دے دی۔ اور خدا جانتا ہے کہ صرف حسینؑ ابن علیؑ ہی نہیں بچے بوڑھے، جوان، مُسن، عورتیں، مرد جو بھی کربلا میں حسینؑ کے ساتھ آیا تھا وہ دل میں ٹھان کے آیا تھا کہ اُس راہ پر صبر کے ساتھ، ہمت و استقلال کے ساتھ ہم بھی گزر جائیں گے جس راہ پر ہمارے امام چلیں گے۔

یہ تربیت تھی حسینؑ کی، تعلیم تھی، نگاہِ انتخاب کا زور تھا، مردم شناسی تھی کہ جس کو چُن لیا وہ بے نظیر تھا، جس کو منتخب کرلیا وہ انتخاب روزگار تھا، جس کو ساتھ لے کے آئے اپنی آپ ہی نظیر تھا۔ محمدؐ ابنِ حنفیہ بھائی تھے آپ کے اور بے نظیر شجاع تھے مگر اُن کو ساتھ لے کے نہیں آئے۔ چھوڑ دیا محمدؐ کو اور یہ کہہ کے کہ

"بھائی تم مدینے میں رہو اور یہاں کے حالات کی مجھ کو خبر دیتے رہو"۔

میں جانتا ہوں کہ حسینؑ ابن علیؑ امام تھے اُن کی اطاعت بھائی پر بھی اُسی طرح واجب تھی جس طرح ہم پر واجب ہے لہٰذا جب امام نے محمدؐ ابن حنفیہ کو مدینے میں قیام کرنے کا حکم دیا تو اُن پر اطاعت حکم امام واجب تھی لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے حسینؑ کی مدد نہ کی۔ مگر کہنے کو بات رہ گئی کہ محمد کو ساتھ نہ لیا عباس کو ساتھ لے کے چلے۔ اپنی جدّۂ ماجدہ جناب اُمِ سلمہؑ کو ساتھ نہ لیا بہنوں کو ساتھ لے کے چلے۔ اپنی والدہ جناب ام البنین کو ہمراہ نہ لیا اپنے ازواج کو ساتھ لے کے نکلے۔ ابن عباس جو عزیز قریب تھے اُن کو ساتھ نہ لیا غیروں کو ساتھ لے کے کربلا پہنچے۔ جو اِدھر اُدھر کے لوگ مدینے سے مکّے کے راستے سے ساتھ ہو گئے تھے اُن کو ایک ایک منزل پر، کربلا میں پہنچنے کے بعد، حد یہ ہے کہ شبِ عاشور تک سمجھا بجھا کے، بیعت ہٹا ہٹا کے رخصت کر دیا۔ مگر حبیبؓ ابن مظاہر کو کوفے سے خط لکھ کے بلایا۔ زہیر ابن قین کو اُنکے خیمے سے بلا کے ساتھ لیا۔

روایت میں ہے کہ جب امام حسینؑ بہ قصد عراق مکے سے چلے تو زہیر قین کے قبیلے والے بھی عراق کے قصد سے مکے سے چلے۔ دونوں قافلے آگے پیچھے روانہ ہوئے مگر زہیر قین کے ساتھی بنی اُمیّہ سے بہت ڈر رہے تھے، اس وجہ سے حسینؑ کے ساتھیوں سے الگ الگ رہتے تھے۔ اگر منزل پر ٹھہرتے بھی تھے تو اپنا پڑاؤ الگ بناتے تھے۔

چلتے چلتے ایک منزل تنگ ملی اور زہیر ابن قین کا قافلہ حسینی قافلے کے قریب اُترنے پر مجبور ہوا، دونوں طرف کے خیمے استادہ ہوئے۔ رات گزری، صبح ہوئی۔ زہیر ابن قین اپنے ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے، کھانا شروع کیا کہ یکایک ایک شخص نے آکے پیغام پہنچایا کہ "زہیر! تم کو فرزندِ رسولؐ یاد کرتے ہیں۔" یہ سُننا تھا کہ خوف و دہشت کے مارے لوگوں کے ہاتھ سے نوالے گر گئے اور سب کے سب دم بخود رہ گئے۔ نہ اِس کی ہمّت تھی کہ حسینؑ کے فرمان سے سرتابی کریں، نہ یہ جرأت تھی کہ بنی اُمیّہ کی عداوت برداشت کریں۔ مجمع یوں ساکت تھا جیسے سروں پر جانور بیٹھے ہیں۔ آخر ایک عورت نے یہ سکوت توڑا۔ محبتِ اہلبیت موج زن ہوئی، ایمان نے ہمّت افزائی کی اور یہ شیر دل عورت یعنی دیلم بنتِ عمرو زہیر کی زوجہ بول اُٹھی کہ "سبحان اللہ! رسولؐ کا نواسہ تم کو بلاتا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ اُٹھو، جاؤ! دیکھو تو حسینؑ کہتے کیا ہیں؟"

یہ سُن کر زہیر ابن قین کھانا چھوڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جلدی جلدی فرزندِ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کسی کو معلوم نہیں، کسی راوی نے نہیں لکھا کہ امام نے کیا کہا، مگر مورخین کا اتفاق ہے کہ زہیر اپنے امام سے باتیں کر کے جو چلے تو مُتبسّم ہوئے۔ اور آتے ہی اپنے خادموں کو حکم دیا کہ "بس میرے خیمے یہاں سے اُکھاڑ کے حسینؑ کے لشکر میں نصب کر دو، جس کا دل چاہے میرے ساتھ چلے اور جس کا دل چاہے آخری مرتبہ مجھ سے رخصت ہو لے کہ دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔" اپنی زوجہ دیلم سے فرمایا کہ "میں نے تم کو طلاق دی، میں تو اب طے کر چکا ہوں کہ حسینؑ کی خدمت میں رہوں گا اور اپنی جان حسینؑ پر نثار کروں گا، مگر میں نہیں چاہتا کہ تو میرے بعد اسیر ہو، قید کی مصیبتیں برداشت کرے۔" یہ فرما کر تمام مال و متاع اپنی زوجہ اور اپنے اعزّا کو ہبہ کیا، زوجہ کو قافلے والوں کے

سپرد کیا کہ اس کو اس کے قبیلے میں پہنچا دینا۔

یہ تمام انتظامات کر کے ایک ایک سے رخصت ہوئے۔ جب زوجہ سے ملنے کی باری آئی تو وہ مومنہ دامن پکڑ کے رونے لگی اور عرض کی کہ زہیر جاؤ خدا حافظ خدا تمہارا انجام بخیر کرے، لیکن دیکھو قیامت کے دن مجھے بھول نہ جانا، حسینؑ کے نانا سے میری سفارش کر دینا" اور دوسری روایت میں ہے کہ جب زہیر نے زوجہ کو طلاق دی تو اس مومنہ نے دریافت کیا کہ "کیوں زہیر کیوں، مجھے طلاق کیوں دی؟" زہیر نے جواب دیا کہ "میں تو کمر باندھ چکا کہ مر جاؤں گا، شہید ہو جاؤں گا مگر اب قیامت تک حسینؑ کی خدمت سے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ البتہ یہ گوارا نہیں کہ تو میرے بعد قید کی جائے اسیر کی جائے"۔ بس یہ سننا تھا کہ زہیر کی زوجہ نے بے چین ہو کے جواب دیا کہ "کیوں زہیر! کیا حسینؑ اکیلے ہیں، اُن کی بہنیں، اُن کی بیٹیاں ان کے ساتھ نہیں؟ زہیر! تم حسینؑ ابن علیؑ کی خدمت میں رہو اور ان کے ساتھ شہید ہو اور میں اپنی شہزادیوں کی خدمت کروں گی جو ان کا حال ہوگا وہ میرا ہو گا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی عورتیں اس تمنا میں حسینؑ کے ساتھ آئی تھیں کہ جو کچھ حسینؑ کے اہلِ حرم پر گزرے گی وہ ہم پر گزرے گی، وہ راحت سے رہیں گی تو ہم بھی راحت سے رہیں گے، وہ قید ہوں گی تو ہم بھی خوشی خوشی ان کے ساتھ قید ہوں گے، وہ سر برہنہ ہوں گی تو ہم بھی سر برہنہ ہوں گے، وہ شہر بہ شہر پھرائی جائیں گی تو ہم بھی ان منزلوں میں ان کے ساتھ رہیں گے۔ مگر یہ تمنا اُن عورتوں کی پوری نہیں ہوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی مگر صرف اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ لُٹا ہوا قافلہ کربلا سے کوفے پہنچا تو چالیس محملیں بے پردہ تھیں جن پر قیدی سوار تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تک تو سب آئے

مگر اس کے بعد جب کوفے سے شام کی طرف روانہ کیے گئے تو سب کے سب ساتھ نہ تھے
کون کون تھے اس کی تفصیل مشکل ہے مگر ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد نے یزید کو شہادت
حسینؑ کی اطلاع دی اور دریافت کیا "اب سرہائے شہداء اور اسرائے کربلا کے ساتھ
کیا سلوک کیا جائے" تو یزید نے جواب میں صرف اتنا حکم دیا کہ "شہیدوں کے سر اور
رسولؐ کے اہلبیتؑ شام کی طرف روانہ کر دیے جائیں" معلوم ہوتا ہے کہ غیروں کی
عورتیں کوفے میں آزاد کر دی گئیں اور محض رسولؐ کے قرابت دار یزید کی طرف روانہ
کر دیے گئے۔ ان اسیروں کی تعداد کیا تھی ہم کو کسی اور تاریخ سے تو نہیں معلوم ہو سکا
مگر امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ ہم بارہ آدمی تھے جن کو یوں باندھا گیا تھا جس طرح
گوسفند باندھے جاتے ہیں۔ کسی کا گلا باندھا، کسی کا بازو باندھا کسی کی کمر باندھی۔
امام فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ عالم تھا کہ جب ایک بیٹھنا چاہتا تو سب بیٹھ جاتے تھے
جب ایک کھڑا ہونا چاہتا تھا تو سب کھڑے ہو جاتے تھے۔

عزادارانِ حسینؑ! کیا انصاف یہی تھا کہ ہر قیدی آزاد ہونے کے لائق
مگر آلِ رسولؐ آزاد کیے جانے کے لائق نہ تھی۔

عزادارانِ حسینؑ! کاش اہلبیت کی فقط اسیری ہی پر اکتفا کی جاتی، مگر
ان ملاعنہ نے غضب یہ کیا کہ بازاروں کی آئینہ بندی کی گئی، گلی اور کوچوں
میں سجاوٹ کی گئی، نامحرموں کا ازدحام اور اس میں علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیوں کا گزر۔
ذرا غور فرمائیے کہ جن کی ماں کا جنازہ پردۂ شب میں اٹھا تھا جب وہ نامحرموں
کے مجمع میں لائی گئی ہوں گی تو اُن پر کیا گزر گئی ہو گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بیتِ حسینؑ کو اس کا پہلے ہی سے دھڑکا تھا۔ چنانچہ

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رانڈوں کا لُٹا ہوا قافلہ دمشق کے قریب پہنچا تو جناب اُمِّ کلثومؑ نے بھائیؑ کے قاتل شمر سے درخواست کی کہ "اے شمر! خدا کے لیے ہم کو اُس دروازۂ شہر سے لے چل جو دربار سے قریب ہو اور جدھر نامحرموں کا مجمع بھی ذرا کم ہو۔ نیز شہیدوں کے سروں کو قافلے سے آگے رکھ تاکہ لوگ سروں کے دیکھنے میں لگ جائیں اور ہمارے چہروں پر نامحرموں کی نگاہ نہ پڑے۔ شمر خاموش ہوا اور اُمِّ کلثوم نے خیال کیا کہ شاید ظالم کو رحم آگیا۔ مگر بھلا شمر اور رحم کرے! یہ ملعون اہلِ بیتؑ کو باب الساعات سے لے کر داخل ہوا جو دربارِ یزید سے سب سے زائد دُوری پر تھا۔ نیز اس راستے میں انبوہ بھی بے انتہا تھا۔ اُمِّ کلثومؑ نے فرمائش کی تھی کہ سروں کو آگے رکھا جائے تو اُس ملعون نے سروں کو محملوں کے درمیان رکھا۔ اور اس ہجوم میں علی کی بیٹیاں، بال سر کے کھُلے ہوئے، وامحمدؐاہ اور واعلیاہ کے نعرے بلند کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

بس عزادارانِ حسینؑ بس! رانڈوں کا لٹا ہوا قافلہ دربار تک پہنچا اور دربار کے دروازے پر قافلہ روک لیا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ابھی دربار کی آرائش مکمل نہ ہوئی تھی۔ جب دربار کی سجاوٹ مکمل ہو گئی تو شمر ملعون قریب آیا۔ "اہلبیتِ حسینؑ اُٹھو! تم کو اسی دربار میں جانا ہے"۔ شہزادیاں کوفے کی گلیوں میں پھرائی گئیں، صبر کیا۔ بازارِ شام کی آئینہ بند بازاروں میں پھرائی گئیں، صبر کیا۔ لیکن نہ معلوم دربارِ یزید کا کیا عالم تھا کہ زینبؑ نے ارشاد فرمایا کہ "میں تو اس دربار میں ہرگز قدم نہ رکھوں گی۔

عزادارو! شمر نے بہ جبر بھیجنا چاہا تو زینبؑ نے آواز دی "اے رقیہؑ ذرا میرے

پاس آجاؤ، اے رباب! ذرا میرے قریب آجاؤ، اے باپ کے سینے پہ سونے والی سکینہ! ذرا پھوپھی کے پاس آجاؤ، بس اب میں اس اُمت کے لیے بد دُعا کرتی ہوں، تم لوگ آمین کہو۔

ع: ادارد! اِدھر جنابِ زینبؑ نے سر کے بال کھولے اُدھر بھائی کے کٹے ہوئے سر پر نظر پڑ گئی، دیکھا کہ بھائی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ بھلا زینبؑ اور حسینؑ کو روتا ہوا دیکھ سکیں۔ تڑپ گئیں۔ فرماتی ہیں کہ اے بھائی! آپ پر کیا مصیبت گزری کہ آپ بعدِ شہادت بھی گریاں ہیں"۔ گلوئے بُریدہ سے آواز آئی کہ "اے بہن! میری محنت اکارت ہوئی جاتی ہے، بھرے دربار میں اسی شان سے چلی جاؤ"۔

الا لعنۃ اللہ علی قوم الظالمین

مجلسِ چہارم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا وَ شَفِیْعِ الْمُذْنِبِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰھْلِ بَیْتِہِ الطَّاھِرِیْنَ ط اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ وَھُوَاَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ ط وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ اِحْسَانًا ط حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ کُرْھًا وَّ وَضَعَتْہُ کُرْھًا ط وَحَمْلُہٗ وَفِصَالُہٗ ثَلٰثُوْنَ شَھْرًا حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىہُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ط

صورت بشری پر لفظ انسانیت کا خطاب دینے والے جناب آدمؑ کی تمام اولاد کو انسان کہنے پر تیار ہیں جس کو فطرت کی طرف سے وہ صورت مل جائے جو ہماری ہے، جس کے اعضا و جوارح کی شکل وہی ہو جو ہماری ہے اسی کو دنیا انسان کہنے پر آمادہ ہے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگ محض صورت میں

انسان ہیں اور بعض صورت اور سیرت دونوں کے اعتبار سے اس نام کے مستحق ہیں۔ بعض لوگ نام کے انسان ہیں، بعض درحقیقت انسان ہیں۔ بعض وہ ہیں جو نقلی بشر اور بعض وہ ہیں جو اصلی۔ وقتی اور عارضی طور سے لباسِ بشری پہن لینے والے بھی ہماری نظر میں انسان ہیں اور مستقل اور پائدار خلعتِ بشری کے مستحق بھی انسان ہیں۔ صورت سب کی ایک، لباس سب کا ایک مگر کوئی صورت کے اندر صفاتِ روحانی کے اعتبار سے جانور ہے، کوئی نفس اور سیرت کے اعتبار سے بھی انسان ہے۔

ہماری نظر تو یہی کہتی ہے کہ تختِ سلطنت پر آپ ہوئے تو کیا اور ہم ہوئے تو کیا۔ مسندِ رسالت پہ زید بیٹھا تو بھی وہی بات اور عمرو بیٹھا تو بھی وہی بات۔ محرابِ امامت میں یہ آگئے تو فرق کیا اور وہ آگئے تو فرق کیا۔ لیکن جو صاحبانِ علم و فہم ہیں جن میں عقل و انصاف ہے وہ جانتے ہیں کہ صورت تو سب ہی کی ایک ہے، اعضاء و جوارح سب ہی کے ایک ہیں لیکن خدمات کی منزل میں، انتخاب کے راستے میں، فرائض کی تقسیم کے وقت تمام کے تمام انسان برابر نہیں ہوتے، ایک نہیں ہوتے۔ بہت سے انسان یہ حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کو چھیڑ کے اپنی باتوں کا مخاطب قرار دیا جائے اور بہت سے ایسے ہیں کہ جو بات کرنا بھی چاہیں تو اُن کی سماعت بھی نہ کی جائے۔ ہمارے کلام میں یہ تفرقے ہیں، ہمارے تخاطب میں یہ امتیاز ہے تو کیا خالق یہ فرق نہیں کرتا؟ اپنے کلام میں حیثیت کا لحاظ نہیں رکھتا؟ اجی وہ تو جس کو اہل نہیں سمجھتا اُس سے بات نہیں کرتا، خطاب نہیں کرتا، کلام کا مستحق نہیں سمجھتا۔ خاک کا پُتلا ہو مگر آدم ہو تو وہ باتیں کرنے کو موجود، حقیقت میں مٹی ہو مگر نوح ہو تو وہ مناجات سننے کو تیار، انسان ہو مگر ابراہیم ہو تو وہ دوست بنانے پر آمادہ، ابنِ مریم ہو مگر عیسیٰ ہو تو وہ کلام کرنے کو موجود،

زبان میں لکنت ہو مگر موسیٰ ہو تو وہ کلیم بنانے پر آمادہ، اُمّی ہو مگر محمدؐ ہو تو وہ اپنی بارگاہِ تقرّب میں بلا لینے کو موجود، ایک غریب ہو، مظلوم ہو، بے کس ہو، دُنیا اس کو ذلیل سمجھتی ہو مگر حسینؑ ہو تو پیدا کرنے والا انسان کہنے کو آمادہ، وصیت کرنے پر تیار، اس کی ولادت کے وقت سے لے کر وفات تک کی سوانح عمری قرآن بنا کے نازل کر دینے کو موجود۔

ہے قرآن میں "اور خدا کا شکر ہے کہ قرآن کی تعلیم، اُس کی ترتیب و تالیف دُشمنوں کے ہاتھ میں ہونے کے بعد بھی اب تک موجود ہے وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا "ہم نے وصیت کی انسان کو کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے"۔ اگر ہم نے کہہ دیا کہ اس آیت کے مخاطب حسینؑ ابن علیؑ تو یقیناً لگتی ہوئی بات ہے، چسپاں ہوتی ہوئی تفسیر ہے، روایاتِ معصومینؑ کی تائید ہے۔ آیت میں واقعات وحالات مذکور ہیں ان کے ایک ایک حرف کے مطابق تاویل ہے۔ مجال ہے کسی کی جو حرف گیری کر سکے، ہمیں ٹوک سکے، غلطی کا الزام دے سکے۔ کیا حسینؑ حقیقی انسان نہ تھے؟ فخرِ نسلِ آدم نہ تھے؟ اشرفِ عالمِ بشریت تھے حسینؑ حسینؑ کے حمل کی مدت چھ ماہ اور دودھ بڑھائی حسینؑ کی دو برس میں ہوئی۔ پوری قوت کی حد تک پہنچے، چالیس برس کے سن میں دعا کی، عمل صالح ایسا کیا جس کا مثل نہیں، اولاد اتنی صالح ہوئی کہ امامت نے نسلِ حسینؑ کا دامن نہ چھوڑا۔ قیامت تک اسی گھر میں جم کے رہ گئی۔ لہٰذا مراد ہیں اس آیت سے اور صرف حسینؑ ابن علیؑ۔

ہاں اس آیت کی ایک تفسیر اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس انسان سے مراد ہیں خاتم النبیینؐ۔ کوئی شبہ نہیں کہ آپ ہی انسانِ کامل تھے، آپ اس قابل تھے کہ کلامِ خدا

کے مخاطب ہوں، آیتِ الٰہی آپ کو انسان کہہ کے پکارے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جن لوگوں نے اس انسان سے ہمارے رسول کی ذاتِ والاصفات کو مراد لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ وَالِدَیْہِ کی جگہ وَلَدَیْہِ ہے یعنی آیت یوں نہیں ہے وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ اِحْسَانًا۔ بلکہ یوں پڑھنا چاہیے وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَلَدَیْہِ اِحْسَانًا۔ پہلی تلاوت کی بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ "ہم نے انسان کو وصیت کی کہ وہ اپنے والدین یعنی ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے"۔ اور دوسری تلاوت کی بنا پر معنی یہ ہوں گے کہ "ہم نے اپنے حبیب محمد مصطفےٰ کو وصیت کی کہ وہ اپنے وَلَدَیْن یعنی دونوں لڑکوں سے نیکی کریں"۔ کیا کہنا اس تفسیر کا، کیا کہنا اس بامحل تلاوت کا۔ ہمارے واسطے نورِ قلب، سرورِ دل، خنکیٔ چشم۔ یقیناً محمدؐ انسان تھے اور انھیں سے خدا نے وصیت کی۔ مگر دُنیا بتائے کہ محمدؐ مصطفےٰ کے یہ دو لڑکے کون تھے جن کے ساتھ نیکی کرنے کی خدا نے وصیت کی؟ رسولؐ کے یہاں ان کے ازواج کے بطن سے بعض لڑکے بھی پیدا ہوئے مگر وہ بہت کم سنی میں انتقال کر گئے۔ کوئی اُن میں چار پانچ برس کا بھی نہ ہوا۔ پھر یہ دو لڑکے کون تھے جن کا آیت میں ذکر کیا گیا، اور جن کو رسول کا وَلَد کہا گیا۔ کیا مجال ہے کسی مسلمان کی آیۂ مباہلہ میں اَبْنَاءَنَا کے بعد اور رسولؐ کے وقتِ مباہلہ حسنؑ و حسینؑ کو ساتھ لانے کے بعد یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ یہ وَلَدَیْنِ رسولؐ حسنینؑ کے علاوہ کوئی اور تھے؟ ناممکن اور بالکل ناممکن۔ تو مانیے کہ ان دونوں بچوں کی یہ خاص منزلت تھی کہ ان کے واسطے خدا اپنے رسولؐ کو وصیت کر رہا تھا دیکھو! اِن دونوں بچوں کے ساتھ احسان کرنا، نیکی سے پیش آنا، ہمیشہ اچھا ہی سلوک کرنا۔ کیوں؟ شاید انھیں دونوں بچوں سے نسلِ رسولؐ کی بقا تھی انھیں

دونوں سے رسولؐ کے نام کی بقا تھی، انھیں دونوں کے دم سے رسولؐ کے دین کی بقا تھی۔ یہی دونوں نورِ نگاہِ پیغمبر تھے جن کی کوششوں نے اسلام کو زندہ رکھا اسی واسطے خدا کا حکم تھا کہ میرے حبیب ان دونوں کا بہت خیال کرنا۔

اعتراض ہو سکتا ہے مذکورۂ بالا تفسیر پر کہ حبیب "وَلَدَین" سے دو بچے مراد تو حسینؑ کے واسطے یہ صحیح ہے کہ اُن کے حمل و فصال کی مدت تیس ۳۰ ماہ تھی۔ مگر حسنؑ میں یہ صفت نہ تھی۔ بے شک حسینؑ کے زمانۂ حمل میں بھی ماں غمگین رہی اور وقتِ ولادت بھی ماں کو صدمہ ہوا مگر حسنؑ کے واسطے تو یہ کچھ نہ تھا۔ لہذا "وَلَدَین" سے تو حسنؑ حسینؑ مراد ہو گئے مگر آگے بڑھ کے تو صرف ایک ہی کا تذکرہ رہ گیا۔ تو میں جواب دوں گا اور صاحبانِ علم میرے جواب پر غور فرمائیں گے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آیت میں والدین کا ذکر ہے یعنی ماں باپ۔ ان کی تفسیر پر بھی تو اعتراض ہے کہ ابتدا میں، تو یہ ارشاد ہوا کہ اے انسان اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان کر، مگر آگے بڑھ کر باپ کا ذکر چھوٹ گیا صرف ماں کا تذکرہ باقی رہ گیا کہ ماں نے مہینوں حمل کی زحمت اٹھائی، وضعِ حمل کی سخت سے سخت تکلیف برداشت کی، دو برس تک دُودھ پلایا۔ یہ تمام ذکر صرف ماں کا ہے باپ کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اس کا جواب علماءِ مفسرین نے یہ دیا ہے کہ ماں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ماں کا حق بہ نسبت باپ کے بہت زائد ہے۔ ہیں دونوں قابلِ شکریہ، دونوں قابلِ احسان و نیکی، مگر ماں کی مشقت بہت زائد ہے۔ اس لیے اس کا حق بھی بہ نسبت باپ کے زائد ہے بس یہی جواب ہمارا بھی ہے کہ رسولؐ کو حکم ہوا کہ دونوں بچوں کے ساتھ احسان کرنا، مگر اس کے بعد خصوصیت سے حسینؑ کا تذکرہ چھیڑ دیا کہ میرے رسولؐ اس بچے کا حق اسکے خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت عظیم ہے۔

بہر حال یہ دونوں تفسیریں، یہ دونوں تاویلیں اس قابل ہیں کہ قبول کر لی جائیں،

ان پر توجہ کی جائے۔ مگر اس کے مقابل وہ تفسیر کہ انسان سے مراد حضرت ابوبکر، خدا کی پناہ!! پہلے تو دنیا کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ بزرگ انسان تھے، البتہ انسان میں کچھ اور تو نہ تھے۔ یعنی صورت تو ضرور کہے گی کہ بڑے کھرے انسان، مگر دیکھنا تو ہے سیرت، اخلاق، صفات۔ اگر یہ حیثیتیں بتائیں کہ انسان، تو ہم بھی مانیں گے کہ انسان۔ دیکھیے، انصاف یہ ہے کہ ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں کہ یہ کیسا وہ کیسے، ان کو برا کہیں یا اُن کو۔ ان کے صفات و عادات بیان کریں یا اُن کے۔ ہو کوئی اچھا تو ہمیں کیا اور رہا کرے کوئی بُرا تو ہم سے مطلب؟ لیکن یہ اسی وقت تک ہے جب تک ہمارے مقابلے میں نہ لائیے۔ ہو کوئی عرش کا تارہ یا خاک کا ذرہ مگر ہم کو کیا غرض؟ لیکن جب آپ مقابلے میں لائیے گا، ہماری چیزیں چھین چھین کے دوسروں کو دیجیے گا تو پھر ہم کو بھی زبان کھولنا ہی پڑے گی، ہاتھ پیر ہلانا ہی پڑیں گے۔ زمین کو دنیا پست کیوں کہتی اگر آسمان کے مقابلے میں نہ آتی۔ سیاہی سے نظریں کیوں ہٹتیں اگر سفیدی کے مقابلے سے الگ رہتی۔ ظلمتوں سے دم کیوں گھبراتا اگر نور کی پردہ پوشی نہ ہوتی۔ شب ہجر کی برائی کیوں ہوتی اگر صبح وصل کے پہلے نہ ہوتی۔ بدبو کو کوئی برا کیوں کہتا اگر خوشبو کے مقابلے میں نہ آجاتی۔ اجی! حد ہے کہ چاند کی پستی ہرگز نہ کھلتی، نور کی کمی محسوس ہی نہ ہوتی اگر آفتاب کے مقابلے میں نہ آجاتا۔ تو ہم قابلِ الزام نہیں کہ کسی کا عیب کیوں بتاتے ہو، کسی کی برائی کیوں کرتے ہو۔ بلکہ قابلِ الزام وہ ہیں جو زبردستی مقابلے پر آئے اور جن کو دنیا مقابلے پر لائے۔

آیت اُتری کسی کے واسطے اور آپ نے گھسیٹا کسی کی طرف تو ہم کو کہنے کا موقع ملا کہ ان میں اتنی صلاحیت کہاں کہ انسانیت کا مصداق بن سکیں؟ اور خیر اگر کسی صورت سے

انسان کہہ دیجیے تو واقعات میں اتنی گنجائش کہاں کہ جس طرف چاہیے کھینچ دیجیے۔ جہالت کے دور میں پیدا ہونے والے، گمنامی کے عالم میں بسر کرنے والے، کفر کی آغوش میں پلنے والے، کسے پتہ کہ کئے ماہ بطنِ مادر میں رہے؟ کسے خبر کتنے دن تک دودھ پیا، ماں باپ کو ان کے کیا خبر کہ بچے کا انجام کیا ہوگا؟ حمل کے زمانے میں غم کی وجہ؟ ولادت کے وقت رنج کا سبب؟ محض اولاد کا مسلمان ہونا صالح ہونے سے بہت دور مگر آیت سے رستہ کشی ہے کہ اُدھر نہیں اِدھر، وہاں نہیں یہاں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر قرآن کی آیتوں میں گویائی ہوتی، نطق ہوتا تو دنیا اُن کی فریادوں کی آواز سنتی۔ وہ عالم کے انصاف پسندوں سے اپنے مظالم کی داستانیں کہے بغیر نہ رہتیں۔ مگر خاموش ہیں، چپ ہیں اس لیے کہ قرآن صامت کی آیتیں ہیں۔ سمجھ گئے تھے اُمت والے کون لینے کے قابل ہے، کون چھوڑنے کے قابل، کون ہر قسم کا ظلم سہہ کے اُف نہ کہے گا اور کون ہمارے مظالم کی حقیقت عالم آشکار کر دے گا۔ کون وہ ہوگا جو ہمارے قبضے میں ہوگا کہ جس طرف چاہیں موڑ دیں، اور کون وہ ہوگا جو زبردست ثبات کے ساتھ مرکزِ حقیقت سے جنبش نہ کرے گا۔ اس لیے قرآن ناطق کو چھوڑا قرآن صامت کو لیا۔ اہلبیتؑ سے روگردانی کی کلام خدا کا دامن پکڑا، نہ اس لیے کہ جدھر قرآن لے جائے اُس طرف اُمت چلے بلکہ صرف اس لیے کہ جدھر ہم چاہیں قرآن کو کھینچیں۔ چلا غریب قرآن اور بظاہر اسی طرف چلا جدھر یہ لوگ لے گئے، مگر آیتیں چشمک زنی کرتی ہی رہیں۔ الفاظ اپنی بے بسی سمجھاتے رہے۔ سورے اپنا مطلب سمجھاتے رہے۔ یہ لوگ خوش کہ ہم نے جو چاہا قرآن کا مطلب نکالا اور قرآن چپ کہ اگر دل میں حقیقت شناسی کی قابلیت ہے تو میں اشارے سمجھا کے چھوڑوں گا۔ آیۂ وَصَّيْنَا الْإِنسَانَ کو

ہوا خواہوں نے اپنے قلم کے زور پر اُدھر پلٹا یا جہاں آیت کا محل نہ تھا، مگر آیت کی ہر ہر لفظ بتاتی رہی کہ حسینؑ کا دامن چھوٹے گا نہیں۔ میں تو مدح کرتی رہوں گی صرف اُس ذات کی جو رسولؐ کا نواسہ، علیؑ و فاطمہؑ کا نورِ نظر، حسنؑ کا بھائی، امامت کا مستحق، محسنِ عالم، انسانیت کا مبلغ، اسلام کا زندہ کرنے والا، نورِ نگاہِ عالم، کربلا کا شہنشاہ صبر کا مالک، راہِ رضا کا سالک، تمام عالم سے بہتر، اعمالِ صالحہ کا فاعل۔

یہ واقعہ ہے کہ پیدا کرنے والا وہ عمل صالح حسینؑ ابن علیؑ کے نامۂ اعمال میں لکھ چکا تھا جو تمام دُنیا کے اعمالِ صالحہ سے بہتر، تمام انبیاء کے اعمال سے بہتر، تمام مرسلین کے عبادات سے افضل تر۔ ہر عمل صالح کی ایک حد ہوتی ہے مگر حسینؑ کے عمل کی بلندی حدودِ فہم بشر سے بالاتر۔ اُن اعمال کا تذکرہ نہیں جو بدتر، بُرے، قابلِ مذمت۔ البتہ وہ اعمال جو نیک ہیں قابل مدح و ستائش ہیں، اُن میں بھی بعض افعال کی منزل پست ہوتی ہے اور بعض کی بلند بعض حدِ مدح و ستائش کے اندر رہوتے ہیں اور بعض حدود مدح و ثنا سے بالاتر، جیسے نماز کوئی شبہ نہیں کہ نیک عمل ہے لیکن ایک وہ نماز جو گھر میں ادا کی گئی دوسرے وہ جو مسجد میں پڑھی گئی۔ ایک میں محض واجبات تھے دوسری میں واجبات و مستحبات دونوں تھے، ایک نماز فُرادا پڑھی گئی دوسری جماعت سے پڑھی گئی۔ یقیناً پہلی بھی نماز ہے مگر دوسری نماز اُس سے بہت بلند۔ اب یوں خیال فرمائیے کہ ایک نماز گھر میں فُرادا پڑھی گئی اور اُس میں صرف واجبات پر اکتفا کی گئی دوسری نماز میں واجبات بھی تھے اور مستحبات بھی، پھر جماعت بھی تھی اور مسجد بھی۔ لہذا نمازیں دونوں تھیں، عمل صالح دونوں تھیں، مگر دوسری نماز پہلی سے اس قدر بلند کہ جس کی حد نہیں۔

اسی طرح ایک وہ عملِ خیر جو صرف اپنے نفس کے واسطے کیا جائے جیسے کسی نے

اپنا پیٹ پالنے کے واسطے کسب معاش کیا حلال ذریعوں سے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ بُرا کام تھا۔ جی نہیں نیک کام تھا اور ضرور تھا مگر اس شخص سے وہ زائد بہتر ہے جس نے اپنے اور اپنے اہل و عیال دونوں کی پرورش کے واسطے محنت کی، مگر اس سے بھی زائد وہ شخص بلند ہے جس نے اس واسطے محنت کی، مشقت کی کہ خود اس کی بھی بسر ہو اور اُس کے اہل و عیال کی بھی بسر ہو، اور بعض اور محتاجوں اور مفلس بندگانِ خدا کی بھی اعانت کرے۔ اور اس سے بھی وہ شخص بہتر اور افضل ہے جس نے اپنے اور اپنے اہل و عیال پر محض خدا کی رضا کے واسطے دوسروں کو مقدم کر دیا۔ جیسے وہ لوگ جو سورۂ دہر پر نگاہ جمائے ہوئے، روزوں کی افطاری یتیم و مسکین و اسیر کو صرف اس لیے دے رہے تھے کہ خدا خوش ہو جائے۔ ماننا پڑے گا کہ ان کے عملِ خیر کی حد نہیں تمام دُنیا سے بہتر اور افضل۔ اب اسی نظریے اور کسوٹی پر تمام دُنیا نہیں بلکہ تمام انبیاء و مرسلین کے اعمالِ خیر کو کھینچئے اور حسینؑ ابن علیؑ کے مقابلے میں لائیے تو آپ کو اقرار کرنا ہو گا کہ جس طرح علی کے لیے خندق کی جنگ میں رسول کی آواز بالکل حق ضَرْبَتُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَتِ الثَّقَلَيْنِ اسی طرح حسینؑ ابن علیؑ کے واسطے ہر انصاف پسند کا یہ اعتراف بالکل حق کہ آپ کی کربلا میں جنگ اور اسکے بعد شہادت محمد مصطفٰے کے سوا تمام عالم کے انبیاء و مرسلین کے اعمالِ خیر سے افضل و بہتر۔

معاذ اللہ! میری یہ مجال نہیں کہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے کسی ایک کی نبوت کا انکار کر دوں یا تین سو تیرہ مرسلین میں کسی کی رسالت کا اقرار نہ کر دوں یا پانچ اولوالعزم پیغمبروں میں سے کسی کی عظمت و جلالت قدر کو گھٹا دوں یا کسی امام کے بلند منازل کو گھٹا کے پیش کروں۔ ہرگز نہیں، سب کی نبوت کا مقر، تمام مرسلین کی رسالت کا معترف، اُن کے خدمات کے سامنے سرِ تسلیم جھکائے ہوئے۔ مگر اس سب کے بعد یہ کہنے پر تیار

کہ خاتم النبیینؐ کے چھوٹے نواسے حسینؑ ابن علیؑ کے خدمات و آپ کے نیک اعمال اور آپ کی محیّر العقول قربانی تمام دنیا کے خدمات سے افضل۔ دیکھیے کام کام ہے اور خدمت خدمت ہے چاہے کوئی کرے، کسی کے ہاتھوں سر انجام پائے لیکن پھر بھی دنیا والوں کی نظریں معمولی انسانوں پر نہیں پڑتیں البتہ اگر کوئی عالی خاندان، عالی مرتبت، بلند منزلت انسان وہی کام انجام دے تو ہر شخص تعریف کرنے کو موجود، تذکرہ کرنے کو تیار، بلکہ اثر لینے کو موجود ـــ وہی کام ایک محتاج، مفلس، کسی پست خاندان والے نے کیا کوئی پلٹ کے بھی نہیں دیکھتا کہ کیا کیا اور کس نے کیا۔ لیکن وہی کام کسی بڑے شخص نے کیا تو سب کی نگاہیں مڑ گئیں کہ کیا کہنا بے نظیر کام کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جو شخص جتنا بلند ہوگا خاندان کی حیثیت سے، حسب و نسب کے اعتبار سے، اپنی ذاتی جلالت و عظمت کے لحاظ سے اسی قدر اس کے کاموں پر دنیا کی نگاہیں زائد پڑیں گی اور دنیا والے اثر زائد لیں گے اور خود بھی ویسے ہی افعال کرنے کی خواہش زائد پیدا ہوگی۔

ایک مومن مگر فقیر، گمنام اُس نے کھدر پہنا، جو کی روٹی کھائی، بے حد سادگی سے زندگی بسر کی مگر کوئی بھی توجہ نہیں کرتا کہ کون ہے اور کیا کرتا ہے لیکن ایک عالم نے یہ سیرت اختیار کی تو اخباروں میں تعریف ہوئی اور ہر شخص نے مدح و ستائش کی، ہر بزم میں اُس کے زہد اور ترکِ دنیا کے قصے چھڑے اور اسی کے ساتھ بے شمار دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ ہم بھی یہی طرز اختیار کریں۔ جی نہیں، علماء کو چھوڑ دیجیے ایک رئیس، دولت مند، راجہ، والئ ملک کوئی کام کرے، کوئی طرز اختیار کرے، کوئی سیرت اختیار کرے تو مدح ہوگی، ستائش ہوگی، تمام دنیا میں شہرت ہوگی اور لوگ اُس کے افعال کی پیروی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اسی لئے مشہور ہے

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" رعایا اُسی دین اور اُسی طرز و طریقے کو اختیار کر لیتی ہے جو دین اور جو طریقہ بادشاہ کا ہو" تو معلوم ہوا کہ وہی کام اگر کوئی معمولی انسان کرے تو دُنیا والے اس کا اثر نہیں لیتے، لیکن اگر وہی کام بڑے لوگ کریں تو اثر عام ہوتا ہے۔ بلکہ خدا بھی ایک حد تک یہ تفرقہ ضرور کر دیتا ہے۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ ہم لوگ دولت و ثروت دیکھتے ہیں، خاندان و حکومت دیکھتے ہیں اور پیدا کرنے والا ان چیزوں پر نظر نہیں کرتا، امیر و غریب، دولت مند و محتاج، عالی خاندان اور پست منزلت اُس کی نگاہِ قدرت میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔ البتہ اسلام، ایمان، اور تقویٰ خلوصِ نیّت اِن چیزوں کے اعتبار سے وہ بھی فرق کر دیتا ہے۔ وہی کام کافر کرتے ہیں کوئی جزا نہیں، لیکن مسلمانوں کے افعال قابلِ توجہ ہیں، اور مومن کا وہی کام قابلِ جزا ہے لیکن اگر متقی ہو، معرفت میں کامل ہو، تو اُس کے اعمال کی بزرگی خالق کے نزدیک بہت زائد ہو گی۔

تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ خاندان، شرافت، دولت اور ذاتی شہرت کے لحاظ سے دُنیا والوں کی نظر میں اعمال بلند ہو جاتے ہیں اور اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اسلام، ایمان، خلوص، تقویٰ کے اعتبار سے خدا کے نزدیک اعمال میں بلندی و پستی قائم ہوتی ہے۔ تو اب حسینؑ ابن علیؑ کی خدمتوں کو پہلے تو اس اعتبار سے دیکھیے کہ فی نفسہٖ کیسی تھیں اس کے بعد اس اعتبار سے دیکھیے کہ حسینؑ دُنیا والوں کی نگاہ میں کس منزلت اور کس پایے کے انسان تھے، اور پھر یہ کہ اُن کی ذات خالق کی نظرِ قدرت میں کس قدر بلند تھی، اور اس کے بعد یہ کہ حسینؑ کے افعال کی غرض کیا تھی؟ اور آخر میں یہ کہ اس فداکاری کے نتائج کیا نکلے؟ اس وجہ سے کہ کام بے حد عمدہ ہو مگر کام کرنے والے کی غرض خراب ہو

تو بالکل بے کار تعلیم حاصل کرنا، پڑھنا لکھنا بہت عمدہ کام ہے لیکن جب غرض یہ ہو کریں اپنے علم کے ذریعے سے دُنیا کو دھوکا دوں، فریب دوں، دولت حاصل کروں تو اب یہ علم قابلِ مذمت۔ نماز بہت نیک عمل لیکن جب غرض یہ ہو کہ دُنیا میری نماز گزاری دیکھے، میری تعریف کرے، یا نمازیں پڑھ پڑھ کے میں دُنیا کو اپنے ایمان دار ہونے کا یقین دلاؤں اور پھر دولت سمیٹوں تو یہ نماز خدا کے نزدیک کسی جزا کی مستحق نہیں۔ اجی حد یہ ہے کہ اسلام و ایمان سے بہتر کوئی عمل نہیں، لیکن اگر اسلام کی غرض یہ ہو کہ محض جان بچالیں اور کافروں کی حمایت کریں تو عینِ نفاق اور جہنم کا مستحق۔

تو معلوم ہوا کہ فعل اچھا ہو تو غرض بھی اچھی ہو لیکن اگر غرض اچھی نہیں تو وہ فعل بھی قابلِ مدح نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کام بُرا ہو مگر غرض اچھی ہو تو قابلِ قبول اور مستحقِ مدح و ستائش، جیسے آپ جھوٹ بولے اور صریحاً جھوٹ بولے مگر صرف اس غرض سے کہ ایک رسول کی جان بچ جائے۔ تو یہ جھوٹ قابلِ مدح ہو گیا، محض اس وجہ سے کہ نیت اچھی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ اعمال کی عظمت و مقبولیت میں غرض اور نیت کو بہت زائد دخل ہے۔ اس کے بعد نتائج اور فوائد بھی فعل کی رفعت بڑھا دیتے ہیں۔ میں نے کسی کام میں بڑی کوشش کی مگر نتیجہ کچھ نہیں، کسی کافر کو مسلمان بنانے میں جان لڑا دی مگر نہ ہوا اثر۔ کام یقیناً اچھا تھا لیکن کچھ زائد قابلِ مدح نہ ہوا، اس لیے کہ نتیجہ نہ نکلا۔ اور آپ نے کوشش کی اور مسلمان بنا چھوڑا تو اب میرے کام کی بہ نسبت آپ کے خدمات بہت زائد بلند ہو گئے۔ تو اب آئیے! سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ حسینؑ کا خاندان کیسا تھا۔

اگر آپ نسل کے اعتبار سے دیکھیں تو جناب آدمؑ اشرف مخلوقاتِ عالم،

وہاں سے بڑھیے تو جناب نوحؑ کی شرافت، اور آگے چلیے تو جناب ابراہیمؑ کی وہ بلند ذات جن کے متعلق خدا کا ارشاد وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ "ہم نے دُنیا کے تمام انسانوں میں ابراہیمؑ کو منتخب کرلیا، چُن لیا اور وہ یقیناً آخرت میں بھی صالحین میں ہیں"۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جناب ابراہیمؑ کی ذات ہماری نگاہوں میں نہیں بلکہ خود پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں انتخابِ روزگار، انسانیت کی فردِ اعلیٰ اور اکمل، نسلِ نوحؑ و آدمؑ میں بے مثل و بے نظیر۔ اِن ہی ابراہیمؑ کی اولاد حسینؑ ابنِ علیؑ۔ بلکہ اس سے بھی زائد یہ کہ ذاتِ ابراہیمؑ میں خصوصیت نہیں خود نسلِ ابراہیمؑ وہ تھی جس کے متعلق ایک مقام پر قرآن نے یوں مدح سرائی کی وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ "اور ہم نے ابراہیمؑ کی نسل کو نبوت اور اپنی کتاب کے ساتھ مخصوص کردیا"۔ یعنی جناب ابراہیمؑ سے قبل تو اور خاندانوں میں بھی نبوت و رسالت آئی مگر جناب ابراہیمؑ کے بعد آپ کی نسل کے علاوہ نہ کوئی نبی ہوا نہ امام ہوا، جو آیا وہ اسی نسل میں آیا اسی خاندان میں آیا۔ اسی آیۃ کا بقیہ حصہ یہ ہے وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا "یعنی ابراہیمؑ کی مزدوری دُنیا ہی میں دے دی"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیت کی تفسیر یہی، لیکن آیات کی ترتیب کچھ اشارہ کر رہی ہے، کچھ سمجھا رہی ہے۔ ترتیبِ واقعات کو دیکھ کر کچھ خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ پہلے تو خدا نے جناب ابراہیمؑ کی مشقتوں کا ذکر کیا اس کے بعد ارشاد ہوا کہ میں نے نبوت اور کتاب خاندان ابراہیمؑ میں مخصوص کردی اسی سے ملا کے ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کی خدمتوں کی جزا دُنیا ہی میں دے دی۔ اس ترتیب کو دیکھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کی زبردست خدمتوں کا

وجہ یہی تھا کہ نبوت اور کتاب نسلِ ابراہیمؑ سے مخصوص ہوگئی ۔ یہ جناب ابراہیمؑ کی جاں کاہیوں کا انعام تھا ۔ تو معلوم ہوا کہ اگر خدمتیں بہتر سے بہتر ہوں تو اُس کی جزا یوں بھی ملتی ہے کہ اس کی اولاد کو کچھ عطا کیا جائے ۔ لہٰذا میں کہوں گا کہ جب ابراہیمؑ کے اعمال کی جزا یہ تھی کہ نبوت وکتاب ان کی نسل سے مخصوص ہو جائے تو اب مسلمان کہیں کہ محمدؐ کے اعمال کی جزا کیا تھی ؟ یا تو یہ کہیے کہ ابراہیمؑ کے اعمال محمدؐ سے بہتر تھے اس لیے ان کو یہ جزا ملی کہ نبوت نسل سے مخصوص ہو جائے لیکن محمدؐ کو یہ جزا نہ ملی ۔ لیکن اگر یہ نہیں منظور تو پھر اقرار کیجیے کہ اگر ابراہیمؑ کی خدمتوں کا صلہ ان کی اولاد کو ملا، تو محمدؐ کی خدمتوں کا صلہ اُن کی اولاد کو ملنا فرض ہے، لازم ہے، واجب ہے ۔

ابراہیمؑ کی اولاد نے کیا پایا نبوت وکتاب تو لازم ہے کہ محمدؐ کی اولاد کو بھی کچھ ایسا ہی ملے ۔ لہٰذا ابراہیمؑ کی اولاد کو نبوت ملی اور محمدؐ کی اولاد کو امامت ملی ، وہ ابتدائی منزل تھی اور یہ آخری درجہ تھا ۔ وہاں توریت وانجیل سی کتاب اور یہاں قرآن سی کتاب ۔ اگر انصاف کی دل میں گنجائش ہے تو تمام دُنیا کو ماننا پڑے گا کہ اگر محمدؐ کی ذات جناب ابراہیمؑ سے بہتر اور خاتم النبیینؐ کے خدمات آپ کے جدِ بزرگوار سے افضل تو پھر امامت وکتاب اولادِ محمدؐ سے باہر ہو ہی نہیں سکتی ۔

اور یوں ہی اگر حسینؑ کے اعمال تمام دُنیا سے افضل تھے تو اس کی جزا یہ تھی کہ جب تک دُنیا قائم رہے ، امامت آپ کی نسل میں قائم رہے ۔ یہ تھی وہ نسل ، یہ تھا وہ خاندان ، وہ بلند منزلت گھرانہ کہ جہاں نبوت بھی موجود رسالت بھی ، خلافت بھی موجود اور امامت بھی ، وحی بھی موجود الہام بھی ، صحیفہ بھی اُترے اور کتاب بھی ۔ اگر کہیے تو یوں کہوں کہ جناب ابراہیمؑ کے خدمات کی جزا تھی کہ جو کچھ ملے وہ انھیں کی نسل کو ،

اور اگر کہیے تو یوں کہوں کہ خاتم النبیینؐ کی شفقتوں کی اُجرت بھی کہ امامت ہے تو اولاد میں اور وہ بچہ بھی محمدؐ ہی کا بچہ ہو جو اپنی شہادت کے اعتبار سے سیّد الشہداء، افضل الشہداء، سیّدِ جوانانِ جنّت۔ اور اگر فرمایئے تو یوں کہوں کہ حسینؑ کی زحمتوں کا صلہ تھا کہ امامت رہے تو اسی گھر میں، اسی نسل میں، انھیں کی اولاد میں۔

خدمتوں پہ خدمتیں بڑھتی گئیں اور عطیوں پر عطیے ملتے گئے۔ خدا کے خلیل نے عبادت کی تو نبوّت کا خلعت انعام میں ملا، فرائضِ نبوّت ادا کیے تو تاجِ رسالت کے مستحق ہوئے جب تبلیغِ رسالت کر چکے تو خطابِ خُلّت عطا ہوا، جب اس راستے میں ثباتِ قدم دکھایا تو امامت کی مسند کے حقدار ٹھہرے، جب امامت میں سعی کر چکے تو نسل میں نبوّت و کتاب آئی، جو دلیل ہے اس کی کہ پہلے وہ انعام بارگاہِ ربّ العزّت سے ملے جو ذاتِ جنابِ ابراہیمؑ سے مخصوص تھے لیکن جب کوئی ایسا درجہ باقی نہ رہا جہاں خلیلِ خدا کی رسائی ممکن ہوتی، اور ابراہیمؑ کی خدمتیں اور آگے بڑھیں تو اب جزا کے واسطے اولادِ ابراہیمؑ چُنی گئی کہ نبوّت بھی ہو رسالت بھی ہو کتاب بھی تمھاری، امامت بھی تمھاری۔ یہی طریقہ خدا نے برتا اور یہی طریقہ دنیا والوں کا ہے۔ آپ نے کسی بادشاہ کی خدمت کی اُس نے انعام میں آپ کو عہدہ دیا، اُس عہدے کے فرائض آپ نے بہترین طریقے سے انجام دیے تو عہدوں کی بلندی اور ملی اور خدمتیں انجام دیں تو ترقی پر ترقی ملتی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں آپ کو منصفِ سلطان نے حکومت کے اُس آخری درجے تک پہنچایا جس سے زائد بلند درجہ حدودِ سلطنت میں کوئی تھا ہی نہیں۔ تو اب بادشاہ نے آپ کی خدمتوں کے صلے میں آپ کی اولاد کو منتخب کیا کسی کو کوئی عہدہ دے دیا، کسی کو کوئی خدمت سپرد کر دی،

جس بچے کو جس عطا کا مستحق دیکھا اس عطا سے اس کو ممتاز کیا۔ ملیں گے آپ کو دنیا میں اور ایسے بہت سے خاندان جو سب کے سب اپنے بزرگوں کے خدمات کے صلے میں اتنے بلند ہو گئے جہاں تک دوسرے خاندانوں کی رسائی نہ ہوئی، تو اب آپ انصاف سے کہیں کہ دنیا کا رسم بھی، خدا کا طرز بھی، تو اب محمدؐ کے خدمات؟ تو کیا ان کی جزا صرف اتنی ہی تھی کہ ذات محمدؐ بلند ہو جائے، مگر اولاد کو کوئی عہدہ نہ ملے۔ ناانصافی ہو گی اگر آپ نے خلافت دوسری طرف پھیری۔

خدا کا انصاف یہی ہے کہ جب علیؑ سا محمدؐ کا بھائی موجود، حسنؑ و حسینؑ سے محمدؐ کے نواسے موجود ہوں تو محمدؐ کی خدمتوں کی جزا یہ تھی کہ خلافت ملے تو انھیں کو، امامت ملے تو انھیں کو، شہادت کی اعلیٰ منزلیں ملیں تو انھیں کو، کتاب ہے تو انھیں کے پاس، ملائک آئیں تو اسی گھر میں، الہام کی منزل ملے تو انھیں کو، خدا کی قسم دنیا نے ناانصافی کی کہ ظلم کر کے اوروں کو دیا مگر خدا نے محمدؐ کے انعام میں جو دیا وہ علیؑ کو دیا، فاطمہؑ کو دیا، حسنؑ کو دیا، حسینؑ کو دیا بلکہ حسینؑ کی اولاد کو دیا۔

یہ وہ نسل طیب و طاہر تھی جس کے متعلق ایک مقام پر تو قرآن میں ارشاد ہوا کہ ہم نے ابراہیمؑ کی نسل میں نبوت بھی قرار دی اور کتاب بھی اور دوسرے مقام پر اسی نسل کی مدح میں دوسری آیت اُتاری مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ پہلی آیت میں صرف ابراہیمؑ کی اولاد کا تذکرہ اور دوسری آیت میں اس نسل کے ابتدائی نقطے سے مدح شروع کی تو آخری نقطے تک تعریف ہی تعریف کرتا چلا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۙ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۚ "ہم نے چھانٹا اور منتخب کیا

آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور ابراہیمؑ کی آل کو اور عمران کی نسل کو تمام عالموں سے۔ یہ وہ نسل ہے جن کے بعض بعض سے ہیں اور خدا ہر شے کو سنتا اور جانتا ہے" نقطۂ اولِ نسلِ انسانی جنابِ آدم اور وہیں سے نگاہِ انتخاب چلی، چن لیا نظرِ قدرت نے۔ پھر نوحؑ کو منتخب کیا، پھر آلِ ابراہیمؑ کو چھانٹا، پھر اولادِ عمران کو پسند کیا۔ کل کی کل نسل منتخب روزگار، نگاہِ قدرت پر چڑھے ہوئے، نبوت و رسالت، کتاب و امامت کے واسطے منتخب شدہ۔ اور انتخاب بھی اس کا جو غلط نگاہ نہیں، جس کے دھوکا کھانے کا وہم نہیں، جو باطن سے اسی طرح واقف جس طرح ظاہر سے، دل کا بھید اسی طرح آشکار جس طرح زبان کی لفظیں۔ پوری نسل سے اسی طرح واقف جس طرح آباؤ اجداد سے۔ اسی نے چنا اور مستحق سمجھ کے چنا، اور جس کو منتخب کیا اسی ایک سلسلے میں منتخب کیا۔ ایک زنجیر محبت تھی جس میں نبوت کی کڑیاں رسالت سے متصل اور رسالت کے حلقے امامت کے قریب، اور بیچ بیچ میں کتابِ خدا کی آیتیں اور آخری سرا بابِ وحدت سے ملا ہوا۔ اسی سلسلے کی بہترین فرد حسینؑ ابن علیؑ جو اس طرح بھی تمام عالم سے بہتر کہ آدم کی اولاد میں داخل اور یوں بھی سرگروہ انسانیت کہ نوحؑ کی ذریت میں شامل اور اس طرح بھی سردارِ امت کہ نسلِ ابراہیمؑ کا شرف اور سب سے زائد یہ کہ محمدؐ کی اولاد۔

مگر دنیا متحیر ہے اور اگر آپ بھی تعجب کریں تو بجا ہے کہ قرآن نے نوحؑ کا ذکر کیا، آلِ ابراہیمؑ کی مدح کی، آلِ عمران کی ستائش کی مگر نہ ذکر کیا تو آلِ محمدؐ کا، کیا محمدؐ کی آل کسی قابل ہی نہ تھی؟ انتخابِ قدرت کے لائق ہی نہ تھی؟ اور اگر انتخاب ہوا تو قرآن کی زبان کون پکڑے ہوئے تھا کیوں نہ اس نے آلِ محمدؐ کا ذکر کیا۔ لیکن دنیا کا

تعجب مٹ جائے گا جب میں یہ بتا دوں کہ قرآن آلِ محمدؐ کو نہیں بھولا، اُس نے ذکر کیا اُن کا اور ضرور کیا، ایک طرح نہیں اسی آیت میں تین طرح سے ذکر کیا کہ اگر دُنیا کے اندھے ایک صورت سے نہ سمجھیں تو دوسری صورت سے سمجھیں اور دوسری صورت پر پردہ ڈالا جائے تو تیسری صورت نشان بتائے، مگر مدحِ آل محمد مٹنے نہ پائے، چھپنے نہ پائے، ہٹنے نہ پائے۔

پہلے تو یوں کہ قرآن نے آلِ ابراہیمؑ کی مدح کی اور آلِ محمدؐ آلِ ابراہیمؑ میں داخل تھے لہٰذا مدحِ آلِ ابراہیمؑ بعینہٖ مدحِ آلِ محمدؐ تھی۔ مواہبِ لدنیہ میں جو اہلسنت کی کتاب ہے یہ روایت موجود ہے کہ خاتم النبیینؐ محمدؐ مصطفےٰ آلِ ابراہیمؑ میں ہیں لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آلِ محمدؐ آلِ ابراہیمؑ میں داخل ہیں۔ دُرِ منثور میں علامہ جلال الدین سیوطی جو اہلِ سنت میں ہیں ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ جنابِ ابراہیمؑ کے اہلِ بیت ہیں۔ روایت میں یہ نہیں ہے کہ آلِ محمدؐ آلِ ابراہیمؑ میں داخل ہیں بلکہ ارشاد ہوا کہ یہی اہلبیتِ ابراہیمؑ ہیں۔ اس روایت کی بنا پر معلوم ہو گیا کہ مدحِ آلِ ابراہیمؑ کسی اور کی مدح نہیں ہے بلکہ مخصوص ہے آلِ محمدؐ سے۔ یہی اہلبیتِ محمدؐ بھی ہیں اور اہلبیتِ ابراہیمؑ بھی ہیں تو معلوم ہوا کہ آیت مخصوص ہے آلِ رسولؐ سے۔

تیسری روایت طبرانی نے نقل کی ہے بریدہ سے، وہ کہتے ہیں کہ جب جنابِ رسالت مآبؐ نے علیؑ کو یمن کی طرف بھیجا تو میں بھی ساتھ تھا۔ یمن میں جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا اس میں سے ایک لونڈی علیؑ نے پسند کر لی۔ مجھ کو بہت ناگوار ہوا۔ جب میں مدینے پلٹ کے آیا اور میں نے لوگوں سے یہ قصہ بیان کیا تو دشمنانِ علیؑ نے مجھ کو اُبھارا کہ میں یہ قصہ رسولؐ سے بیان کر دوں تاکہ رسولؐ علیؑ سے ناراض

ہو جائیں۔ ہم لوگ یہ باتیں کر رہے تھے اور رسولؐ پشت در سے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ ہماری باتیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ آپ دروازہ کھول کے نکل آئے اور انتہائی غصے میں فرمایا کہ "اُن لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو علیؑ سے عداوت رکھتے ہیں۔ سُن رکھو! کہ جو علیؑ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے، اور جس نے علی کو چھوڑا اُس نے مجھ کو چھوڑا، علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں، میں ابراہیمؑ کی طینت سے پیدا ہوا اور علیؑ میری طینت سے پیدا ہوے"۔ اس کے بعد آپ نے آیت پڑھی

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۙ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ "یہ وہ نسل ہے جس کے بعض بعض سے ہیں"۔ اے بریدہ! ایک لونڈی کی کیا حقیقت، علیؑ کا حق اس سے بہت زائد ہے"۔ ماموں رشید امام رضاؑ سے دریافت کرتا ہے کہ آل محمدؐ کے سب سے افضل ہونے کی دلیل؟ آپ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ الخ اے ماموں! آل ابراہیمؑ ہم ہیں جن کو خدا نے تمام عالم سے بہتر قرار دیا" تو معلوم ہوا سُنّی شیعہ سب کا اتفاق کہ آلِ ابراہیمؑ سے مراد آلِ محمدؐ۔ تو قرآن نے مدح آلِ محمدؐ کر کے چھوڑی۔

اس کے بعد آیت ارشاد کرتی ہے کہ ہم نے آلِ عمران کو منتخب کیا۔ عام مسلمان کہتے ہیں کہ اس سے وہ عمران مراد جن کے نواسے حضرت عیسٰیؑ۔ ہوگا اور یہی مراد ہوگا لیکن کہنے میں بات تو آئی کہ آل سے مراد نواسہ۔ تو اب فرمایئے کہ محمدؐ کے نواسے آلِ محمدؐ ہوے یا نہیں لیکن یہ تو اغیار کی تفسیر تھی کہ اس عمران سے مراد جناب عیسٰیؑ کے نانا۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں تین عمران گزرے۔ پہلے عمران جناب موسیٰؑ اور ہارون کے والد ماجد، دوسرے جناب مریم کے والد اور جناب عیسٰیؑ کے نانا۔

اور تیسرے عمران علیؑ کے پدر بزرگوار جناب محمدؐ مصطفےٰ کے چچا یعنی جناب ابوطالبؑ۔ خود امیر المومنینؑ نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ میرا نام زید ہے اور میرے والد کا نام عمران ہے اور اسی لیے دُنیا آپ کو علیؑ عمرانی کہا کرتی تھی۔ علمائے انساب میں سے بعض نے اس کی تصریح کی ہے کہ امیر المومنینؑ کے پدر بزرگوار کی کنیت ابوطالب تھی اور اصلی نام عمران تھا۔ جیسے خود رسولؐ اللہ کی کنیت ابوالقاسم اور اصلی نام محمدؐ، اور امیر المومنین کی کنیت ابوتراب اور نام علیؑ۔ امام حسنؑ کی کنیت ابومحمدؐ اور نام حسنؑ، امام حسینؑ کی کنیت ابوعبداللہ اور نام حسینؑ۔ یوں ہی علیؑ کے پدر بزرگوار کی کنیت ابوطالب تھی اور اسم مبارک عمران۔ اب پڑھیے اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ "خدا نے تمام دُنیا سے منتخب کیا اور بہتر و افضل قرار دیا آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمران کو۔" تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں عمران سے وہ مراد نہیں تھے جو پہلے گزرے بلکہ ابوطالب مراد تھے جن کی آل بعینہٖ آلِ محمدؐ۔ یا یوں کہہ لیں گے کہ وہ عمران بھی جو جناب موسیٰ اور ہارون کے والد، اور وہ عمران بھی جو جناب عیسیٰ کے نانا، اور وہ عمران بھی جو علیؑ کے پدر بزرگوار، سب کی آل قابلِ انتخاب اور سب کی اولاد لائقِ مدح و ثنا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر خدا کو اولادِ ابوطالب کی مدح کرنا تھی تو جو نام مشہور تھا یعنی ابوطالب وہ کیوں نہ ذکر کیا عمران کیوں کہا جو کم مشہور۔ تو میں عرض کروں گا کہ محض اسی وجہ سے کہ خدا کو معلوم تھا کہ دُنیا علیؑ کی دشمن ہو گی۔ عدو ہو گی کسی طرح گوارا ہی نہ کرے گی کہ ابوطالبؑ یا آلِ ابوطالب کا ذکر قرآن میں باقی رہے۔ لہٰذا جب

عالم کو ضد ہے کہ ابوطالب کا ایمان نہ ثابت ہونے دے تو یہ کب گوارا ہوگا کہ وہ آیت قرآن میں رہ جائے جس میں ابوطالب کا تذکرہ ہے۔ اس لیے عمران کا ذکر گیا اور آیت وہاں رکھی جہاں جناب عیسیٰ کا تذکرہ، تاکہ مدح ابوطالب قرآن میں باقی رہے۔

لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اگر آلِ ابوطالب قابلِ مدح دستائش تھی تو پھر آلِ محمدؐ کیا اس قابل نہ تھی کہ قرآن میں اس کی ثنا وصفت کی جائے تو میں عرض کروں گا کہ اگر آلِ ابوطالب اور ہوتی اور آلِ محمدؐ اور ہوتی تو یہ اعتراض صحیح تھا لیکن جب دونوں ایک ہی ہیں تو اعتراض کا محل نہیں جو ابوطالب کی آل ہے وہ آلِ محمدؐ اور جو آلِ محمدؐ ہیں وہ آلِ ابوطالب۔ تو اب اگر خدا نے آلِ ابراہیمؑ کہا تو اس سے مراد آلِ محمدؐ اور اگر آلِ عمران کہا تو اس کے مصداق بھی آلِ محمدؐ۔ ہاں! اس آلِ عمران کہنے سے اتنا فائدہ اور بھی ہوگیا کہ اگر آلِ محمدؐ کہا ہوتا تو دشمن کہہ دیتے کہ حسنؑ و حسینؑ تو اس آیت میں داخل ہیں مگر علیؑ اس آیت سے خارج۔ مگر آلِ عمران کہنے سے امیرالمومنینؑ، سیدہ نساء عالم اور حسنؑ و حسینؑ سب داخل ہوگئے۔

تیسرے اس آیت میں آلِ محمدؐ اس طرح بھی داخل کہ روایات کہتے ہیں تفاسیر اولادِ رسولؐ بتاتی ہیں کہ یہاں آلِ محمدؐ کی لفظ موجود تھی۔ تفسیر قمی میں ہے کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ (وَاٰلَ مُحَمَّدٍ) عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ یعنی "خدا نے تمام انسانوں میں چن لیا آدمؑ ونوحؑ کو آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمران (و آلِ محمدؐ کو)" مگر قرآن جمع کرنے والوں نے آلِ محمدؐ کی لفظ نکال دی۔ تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ کی روایت موجود ہے کہ اس آیت میں آلِ محمدؐ بھی تھا مگر دشمنوں نے نکال دیا۔ تیسری

روایت میں ہے کہ آیت یوں بھی اٰلَ اِبْرَاهِیْمَ وَاٰلَ مُحَمَّدٍ آل عمران کا تذکرہ نہ تھا مگر لوگوں نے محمد کی جگہ عمران لکھ دیا۔ بلکہ اہلسنت کے زبردست عالم ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابن مسعود کے قرآن میں آل عمران کے بعد آل محمد کا لفظ بھی موجود تھا۔ یہ ابن مسعود کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ بڑے صحابیوں میں سے تھے۔ یہ ابن مسعود وہ تھے کہ جب ایک شخص نے ان کا تذکرہ امیرالمومنینؑ کے سامنے کیا تو آپ نے فرمایا کہ انھوں نے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور قرآن ان کے پاس ہے وہ عالم قرآن ہیں۔ وہ ابن مسعود جن کی تفسیر ائمہ اہلبیت کی تفسیر کے مطابق ہے۔

ابھی احدیہ ہے کہ ابن مسعود وہ تھے جن کے پاس اصحاب رسولؐ اپنا قرآن صحیح کرنے کو آتے تھے اور اُن کے پاس بیٹھ کے قرآن پڑھتے تھے اور تعلیم قرآن حاصل کرتے تھے۔ وہ عبداللہ ابن مسعود جن کی مدح و ثنا کرتے ہوئے امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب ارشاد فرماتے ہیں "زمین سات آدمیوں کے واسطے خلق کی گئی۔ انھیں سات کی برکت سے تمام لوگوں کو رزق ملتا ہے۔ انھیں کے طفیل میں پانی برستا ہے انھیں کی بدولت خدا اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ خدا کی بناوا لعظمۃ للہ بلند کر دی۔ حدِ فضیلت اور بہت بلند کر دی۔ یعنی فضائل کی منزل اس قدر بلند ہو گئی جہاں طائرِ وہم و خیال کی رسائی مشکل بڑھ گیا اشتیاق سننے والوں کا اور بے حد بڑھ گیا کہ یہ کون ہیں جن کی مدح علیؑ کی زبان پر اور پھر ان الفاظ کے ساتھ۔ زمین سات آدمیوں کے واسطے خلق ہوئی۔ سات کیا ہیں سبع سیارات عالم ہیں جن کی حرکت میں نظام عالم وابستہ، خزانۂ قدرت کے بے نظیر جوہر ہیں۔ باعث رزق عالم سات برگزیدہ جماعت ہیں

جن سے تمام دُنیا سیراب ہو رہی ہے۔ اچھا آیئے امیرالمومنینؑ ہی کی زبان سے یہ ساتوں نام بھی سُنیئے۔ فرماتے ہیں ھُمْ اَبُوذَرٍ وَسَلْمان وَمِقْدَاد وَعَمّار وَعَبْدُاللّٰہ ابنِ مَسْعُود وَحُذَیْفَۃُ الْیَمَانِی، پہلے ابوذر دوسرے سلمان تیسرے مقداد چوتھے عمّار پانچویں عبداللہ ابن مسعود چھٹے حذیفہؓ یمانی۔

سُن لیا آپ نے یہ بنی ہاشم تو نہ تھے، قرابت دار رسولؐ تو نہ تھے، اہلبیتؑ میں تو نہ تھے، غیر تھے، صحابی تھے۔ پھر علیؑ نے ان کی مدح کی یا نہیں؟ اور جب علیؑ نے مدح کی تو ہماری مجال ہے کہ تعریف نہ کریں۔ مگر ہاں امیرالمومنینؑ سے اتنا اور دریافت کر لیجیے کہ یہ تو آپ نے چھ ہی نام گنوائے اور ساتواں؟ تو امیرالمومنین فرماتے ہیں "اَنَا" میں ساتواں ہوں۔ مگر صرف "اَنَا" کہہ کے خاموش نہیں ہوئے بلکہ ارشاد ہوتا ہے اَنَا اِمَامُھُمْ میں ان کا امام ہوں۔ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اُمت ایسی ہو تو امام ایسا ہو، اور امام ایسا ہو تو اُمت ایسی ہو۔ ستر ہزار ہوں مگر دوشِ زمین پر بار تو اُن کے مقابلے میں یہ سات بہتر جو فخرِ نسلِ بشر۔ آپنے ملاحظہ فرمایا کہ جس کے ماموم، اُمت والے، پیروی کرنے والے ایسے ہوں کہ اُن کی وجہ سے زمین خلق کی گئی، دُنیا کو رزق ملا وہ امام خود کتنا بلند ہوگا۔

کہنے کو دل چاہتا ہے کہ اُن کے دم سے زمین بنی اور علیؑ کی وجہ سے افلاک بنے۔ رسولؐ کے واسطے حدیث قدسی کا ارشاد لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ "اے میرے حبیب اگر تو نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔" اور رسولؐ کا ارشاد اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ "میں اور علیؑ دونوں ایک نور سے ہیں۔" لہذا جس طرح ذاتِ محمدؐ باعثِ خلقتِ افلاک اسی طرح وجودِ ذی جودِ علیؑ سبب خلقتِ سماوات۔

تو عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ابن مسعود کا سا عالی منزلت صحابی اس کے قرآن میں آلِ عمران کے بعد آلِ محمدؐ کی لفظ موجود تھی مگر جب قرآن جلائے گئے تو وہ صحیفے رکھ لیے گئے جس میں آلِ محمدؐ کا نام نہ تھا اور وہ سب قرآن پھونک دینے کے لائق ٹھہرے جن میں آلِ محمدؐ کا تذکرہ تھا۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ کتاب خدا میں علیؑ کا ذکر دکھاؤ، اپنے کلمے کا ثبوت قرآن مجید سے پیش کرو، ائمۂ معصومینؑ کی امامت کا ثبوت کلام خدا سے دو۔

لیکن ان دیدہ دلیری کرنے والوں سے کون کہے کہ تم پورا قرآن حرف بہ حرف مع تفسیر و تاویل نزولی کے اسی طرح پیش کرو جس طرح خدا نے رسولؐ پر نازل کیا تھا تو ہم سے حرف حرف کا ثبوت قرآن سے لو۔ مگر جب قرآن سے وہ چیزیں نکال دیں تو ہم سے ثبوت مانگنا ایسا ہی ہے کہ جیسے میرے منبر سے اُترنے کے بعد کوئی صاحب میری کتاب گھما دیں اور مجھ سے سوال کریں "جو کچھ تم پڑھ رہے تھے اگر یہ تمہارا ہی مسودہ تھا تو ذرا دکھاؤ؟" اس وقت کوئی صاحب قرآن سے سورۂ حمد نکال دیں اور ہم سے فرمائیں میں آپ کے قرآن کو نہیں مانتا "میرے قرآن میں دکھلایئے کہ سورۂ حمد کہاں ہے؟" بے شک اس کا جواب میرے پاس کچھ نہیں اور کسی کے پاس نہیں۔

پہلے تو آپ نے قرآن میں ترمیم کی جہاں جہاں آلِ محمدؐ کا ذکر تھا تفسیر کی صورت میں نکال باہر کیا۔ پھر ترتیب بدل کے اور گڑبڑ کی پھر اپنے دل کی گڑھی ہوئی تفسیریں دُنیا میں شایع کر کے اور بھی پردے ڈالے، پھر مدحِ اہلبیتؑ کرنے والوں کی زبانیں کاٹ کے، گردنیں کاٹ کے، دیواروں میں چُن کے، اُن کے خون سے گارا بنا کے ذکرِ اہلبیتؑ چھپا ڈالا۔ ان تمام باتوں کے بعد ہم سے ارشاد ہوتا ہے کہ تم یہ دکھا دو اور وہ دکھا دو۔ اور جب ہم اپنے اماموں کی تفسیر پیش کریں، اُن کے روایات پیش کریں تو آپ فرمائیں کہ

یہ تو تمہارے ہیں، ہماری تفسیر دکھاؤ۔ اور جب ہم آپ کی تفسیر دکھا دیں تو آپ فرما دیں کہ اجی یہ تو ہم میں سے نہ تھا تقیہ باز شیعہ تھا اور اگر ہم یہ بھی ثابت کر دیں کہ شیعہ نہ تھا تو آپ فرما دیں کہ اجی! مصنف تو شیعہ تو نہ تھا مگر غیر معتبر تھا۔ ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آپ کے نزدیک معتبر تھا تو اب جواب یہ ہے کہ یہ چیز کتاب میں نہ تھی کسی شیعہ نے اس کتاب میں بڑھا دی۔ اس دھاندلی کی حد نہیں، اس ضد کا کوئی جواب نہیں، اس اندھیر کا کوئی علاج نہیں۔

خدا عالم الغیب ہے، اُس کو علم تھا کہ میرے کلام پر کیا کیا ظلم گزریں گے کس کس صورت سے قرآن کے معانی و مطالب میں تحریف کی جائے گی۔ لہذا اُس نے بھی ذکر اہلبیت باقی رکھنے کے واسطے کنایہ اور اشارہ تفسیر و تاویل میں راہیں اختیار کر لیں کہ دنیا کوشش کرے مگر اُن کی تمام کوشش کرنے کے بعد ذکر آلِ رسولؐ قرآن کے دامن میں رہے اور قیامت تک رہے مگر دیکھنے کے واسطے ایمان کی نگاہیں ہوں، خوفِ خدا کی قوت ہو، صداقت و دیانت کی رہبری ہو، حق و انصاف کے اشارے ہوں، تقویٰ اور پرہیزگاری کے بیتنے ہوں، اگر یہ سب چیزیں جمع ہو جائیں تو اس قرآن میں سب کچھ ہے۔ حق نما ہے اور حق کے اشارے ہیں، صداقت کے جلوے ہیں، ایمان کے تفاصیل ہیں، الفاظ کے پردے ہیں اور ان میں ایمان کا نور ہے۔ کلمات کے سحاب ہیں اور دامنِ سحاب میں آفتابِ صداقت کا جلوہ ہے، سوادِ کتابت کی ظلمت ہے، اور ظلمتوں میں ماہِ امامت کی ضیا باری ہے۔ جیسے آنکھ کے پردوں میں نورِ بصر، سینے کے اندر دل کی حرکت، دل کے غلاف میں محبت کے جذبات، غنچۂ سر بستہ میں خوشبو کی لہریں۔ رہیں گے یہ جلوے اور

قیامت تک رہیں گے جب تک وارثِ قرآن، جانشینِ محمدؐ، خدا کا خلیفہ، آلِ رسولؐ کی وراثتوں کا مالک غیبت کے پردے اُلٹ نہ دے۔ جب وہ ظاہر ہوں گے تو قرآن اپنی اصلی تفسیر و تاویل میں ظاہر ہوگا۔ جب عالم کی نگاہیں امامت کے نور سے روشن ہوں گی تو قرآن کی اصلی صورت بھی روشن ہوگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ امام غیبت میں ہے تو قرآن پردے میں ہے اپنی حقیقی صورت بدلے ہوئے دُنیا کے ہاتھ میں ہے مگر جب پردے کا محل نہ ہوگا اُس وقت قرآن اپنی اصلی صورت کے ساتھ حقیقی تفسیر و تاویل کے ساتھ دنیا کے سامنے ہوگا۔ رسول کا عَلَم لپٹا ہوا، علیؑ کی ذوالفقار نیام کے اندر، امام غیبت کے پردوں میں پوشیدہ تو قرآن بھی اپنی تفسیر و تاویل کے دامن سمیٹے ہوئے، صورت نزولی چھپائے ہوئے، منتظر ہے کسی ایسے آنے والے کا جو عَلَمِ رسولؐ کا پھریرہ کھول دے، ذوالفقار کو نیام سے نکال لے، علمِ محمدی کی تعلیم عام کر دے، غیبت کے پردے ہٹا دے، ایمان والوں کے چہرے سے تقیے کی نقاب اُلٹ دے۔ جسمِ کفر سے رِدائے نفاق اُتار دے۔

یاد رکھیے کہ جب تمام عالم اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوگا تو پھر قرآن بھی اصلی صورت سے نظر آئے گا۔ نہ چھپاتا قرآن اپنے پوشیدہ مطالب اور ہرگز نہ چھپاتا، اگر زنگِ عالم دیکھ نہ لیتا۔ ہرگز نہ پوشیدہ کرتا اپنی حقیقی تفسیر و تاویل، اگر تفسیر و تاویل بیان کرنے والوں کی گردنیں تلوار کے نیچے نہ دیکھتا۔ مگر چپ ہوگیا کہ اعلانِ صداقت کرنے والوں کی زبانیں کٹتے دیکھیں، خاموش ہوگیا کہ بولنے والوں کی گردنیں تلواروں کے نیچے دیکھیں، چھپائے اپنے حقیقی مطالب کہ تقیہ نہ کرنے والوں کو قید ہوتے دیکھا، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھیں، درختوں پر صلیب دیکھے،

اور مظلوموں پر ظلم دیکھے، جب امامت قید خانوں کی دیواروں میں تو قرآن بھی جزدانوں کے اندر رہا۔

لیکن آپ یاد رکھیں کہ آلِ محمدؐ کی فضیلت ہر عالم میں قرآن کے دامن میں رہی، اور قرآن آلِ محمدؐ کی فضیلت بیان کرتا ہی رہا۔ اہلبیتِ رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ جنگلوں سے گزرتا ہوا، شہر بہ شہر پھرتا ہوا داخلِ شام ہوا۔ دمشق، یزیدی سلطنت کا پایۂ تخت، دشمنانِ رسولؐ سے بھری ہوئی راہیں، مرد و عورت کا بے شمار ہجوم، تمام شہر آئینہ بند، ہر طرف فرحت و سُرور۔ اور اِدھر محمد مصطفٰےؐ کی اولاد رسن بستہ، شہیدوں کے سر نیزے پر بلند، آلِ رسولؐ بے مقنعہ و چادر، بیمار کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوق خاردار۔ کہ ایک شامی آگے بڑھا اور آلِ رسولؐ کو اُسرائے تُرک و دیلم سمجھ کے سب و شتم میں زبان کھولی۔ اور اہلبیتؑ کے دلوں پر زخم پڑنے لگے۔ جب دل کھول کے باتیں سُنا چکا تو ہمارے بیمار امام نے جُھکا ہوا سر بلند کیا، خاموش زبان کو جنبش ہوئی اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اے شیخ! تونے قرآن پڑھا ہے؟" اُس نے عرض کی "ہاں! میں برابر پڑھتا ہوں"۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت بھی پڑھی "قُلْ لَّا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا الخ" اُس نے جواب دیا "ہاں، ہاں! ضرور پڑھی"۔ آپ نے فرمایا "یہ آیت بھی پڑھی کہ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ" اُس نے جواب دیا کہ "جی ہاں! خوب پڑھی ہے"۔ اب امام فرماتے ہیں کہ "تونے یہ آیت بھی پڑھی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الخ" اُس نے عرض کی "جی ہاں! میں جانتا ہوں کہ یہ بھی قرآن کی آیت ہے۔ مگر تم کو اِن آیتوں سے

"کیا مطلب؟" آپ نے ارشاد فرمایا "او، تو کچھ نہیں مگر ہم رسولؐ کی اولاد ہیں۔"
بس، یہ سُننا تھا کہ اُس شامی نے دستِ دعا بلند کیے اور عرض کی درگاہِ باری میں کہ "پیدا کرنے والے! میں توبہ کرتا ہوں، اُن سے بری ہوں، بیزار ہوں۔"

عزادارانِ حسین! آپ کو معلوم ہے کہ معاویہ کی ابتدا ہی سے بھرپور کوشش تھی کہ شام والے مراتبِ اہلبیت سے واقف نہ ہونے پائیں۔ کوششیں تھیں اور منظم کوششیں کہ علیؑ و آلِ علیؑ کے اس رشتے کو جو ان کو پیغمبرؐ سے تھا دُنیا کی نگاہوں سے چھپا دیا جائے۔ کبھی کہا گیا کہ پیغمبر نے اپنے بعد کوئی اولاد ہی نہ چھوڑی۔ کبھی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ معاذ اللہ علیؑ ایک ڈاکو کا نام تھا اور اس سب کے بعد یہ کہ جب حسینؑ ابنِ علیؑ کو شہید کیا گیا تو اعلان کر دیا گیا کہ معاذ اللہ ایک خارجی نے خروج کیا تھا جس کو قتل کر دیا گیا اور اس کے اہلبیت اسیر ہو کر آ رہے ہیں۔

اور اسی لیے شام والوں کی اکثریت اہلبیتِ رسالت سے ناواقف تھی۔ اور اسی وجہ سے سید سجادؑ وقتاً فوقتاً اپنا تعارف شام والوں سے فرما دیا کرتے تھے۔
بہر حال ایک تو یہ موقع تھا جب امام نے اپنا تعارف کرایا اور دوسرا موقع وہ تھا کہ جب امام نے دربارِ یزید میں اپنا تعارف کرایا تھا۔ اور اسی واقعہ کو آخر کلام میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

یزید کا بھرا ہوا دربار ہے۔ اور بیمار امام بحالتِ اسیری دربار میں موجود کہ یزید حکم دیتا ہے اور ایک خطیب منبر پر جا کر آلِ ابوسفیان کی مدح کرتا ہے اور علیؑ و آلِ علیؑ کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے۔ جب گستاخیاں حد سے بڑھیں تو ہمارا امام تڑپ کر بولا "خدا تجھ پر لعنت کرے، مخلوق کی رضامندی کے لیے خدا کی ناراضگی مول لیتا ہے" اور اس کے بعد

یزیدؑ کی طرف خطاب کر کے اجازت چاہی کہ آپ بھی بالائے منبر تشریف لے جا کر تقریر فرمائیں۔

یزید اجازت دینے پر تیار نہیں مگر دربار والے سفارش کرتے ہیں کہ اس نوجوان کو اجازتِ تقریر کیوں نہیں دیتا۔ بھلا یہ کم عمر مقرر جو بیمار، ناتواں بھی ہے، اسیر بھی ہے، عزیز مردہ بھی ہے دُنیا میں کیا انقلاب لے آئے گا۔ یزید نے جواب دیا تمھیں نہیں معلوم • اِنَّہٗ مِنْ اَھْلِ بَیْتٍ قَدْ زُقُّوا الْعِلْمَ زَقًّا، "ان کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جن کو گھٹی میں علم پلا گیا ہے"۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ اس منزل پر بھی یزید نے یہ نہیں کہا کہ ان کا تعلق خاندانِ نبوّت سے ہے بلکہ دنیا کو گمراہ رکھنے کے لیے کہا تو صرف اتنا کہ "ان کا تعلق اس خاندان سے ہے جس کی ہر فرد بچپن ہی سے کمالِ علم کی منزل پر فائز ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ناواقفیت اور جہالت کے پردے تھے جن کو یزید پڑا رہنے دینا چاہتا تھا اور امام اٹھا دینا چاہتے تھے۔ بہرحال دربار والوں کا اصرار بڑھا، یزید مجبور ہوا اور امامؑ بالائے منبر تشریف لے گئے۔

عزادارانِ حسینؑ! آپ نے بہت سے مقرروں کی تقریریں سُنی ہوں گی، بہت سے خطیبوں کے خطبے سماعت فرمائے ہوں گے لیکن ذرا انصاف سے فرمایئے کہ آج تک آپ نے ایسا بھی خطیب دیکھا ہے کہ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں، پیروں میں بیڑیاں ہوں، گلے میں طوقِ خاردار ہو۔

ایک مقرر کے لیے، ایک خطیب کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ کھلے ہوں۔ کیونکہ بہت سی باتیں اشاروں کی مدد سے سمجھائی جاتی ہیں۔ ضروری ہے کہ

گردن آزاد ہو تاکہ مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خطاب کر سکے۔ مگر اللہ رے بیمارِ کربلا کی مجبوری و بے بسی کہ ہاتھ بندھے ہیں اشارے کریں تو کیونکر کریں۔ گردن میں اتنا بھاری طوق ہے کہ گردن کا اٹھانا کیسا حرکت دینا بھی ممکن نہیں مگر اس عالم میں بھی حسینؑ ابن علیؑ کا جانشین، علیؑ کی یادگار، امامِ وقت، پیغامِ الٰہی کا ذمہ دار وہ خطبہ دیتا ہے جو علیؑ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

طولانی خطبے کی ابتداء حمدِ خدا سے کر کے بتا دیا کہ آلِ محمدؐ اس ہجومِ مصائب میں بھی یادِ الٰہی کو فراموش نہیں ہونے دیتے۔ حمد و ثناءِ الٰہی فرمائی تو درباری جھوم اُٹھے، مدحِ رسالت مآبؐ فرمائی تو درباریوں نے گواہی دی کہ ایسی فصاحت ہم نے آج تک دیکھی نہیں۔

حمدِ الٰہی اور مدحِ پیغمبرؐ سے فارغ ہوئے تو علیؑ کا تعارف کرایا کہ علیؑ کون تھے کن مراتب کے حامل تھے اور رسولؐ سے ان کا رشتہ کیا تھا۔ علیؑ کے تعارف کے بعد فاطمہ زہراؑ کے مرتبہ سے روشناس کرایا، پھر فضائلِ امام حسنؑ بیان فرمائے اور سب کے آخر میں امام حسینؑ کا درباریوں سے تعارف کرایا۔

دربار میں سناٹا ہے اور حسینؑ کا لال دربار کو اپنی مٹھی میں لیے ہوئے اپنے جد کا تعارف کرا رہا ہے۔ اور درباریوں کو بتا رہا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں، دینِ الٰہی کی تبلیغ میں اہلبیتِ پیغمبرؐ نے کتنی جلیل القدر خدمتیں انجام دیں۔ سب کچھ بتا دیا لیکن اس راز پر سے پردہ نہ ہٹایا کہ خود امام کا رسولؐ و اہلبیتِ رسولؐ سے کیا تعلق ہے۔ ہاں جب مکمل تعارف کرا چکے تو اب فرماتے ہیں درباریو! کیا تمھیں خبر ہے کہ "اَنَا ابْنُ مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰی اَنَا ابْنُ عَلِیِّ نِ الْمُرْتَضٰی

اَنَا ابْنُ فَاطِمَۃَ الزَّھْرَا" میں محمد مصطفٰے کا فرزند ہوں، میں علیؑ مرتضٰی کا فرزند ہوں، میں فاطمہ زہراؑ کا فرزند ہوں، میں حسینؑ شہید کربلا کا فرزند ہوں، میں اُس کا فرزند ہوں جس کو تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کو پس گردن سے ذبح کیا گیا، میں اس کا فرزند ہوں جس کی لاش تین دن تک بے غسل و کفن جلتی ہوئی زمین پر پڑی رہی۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کی صفِ عزا املاک نے آسمان پر بچھائی، میں اُس کا فرزند ہوں جس پر فلک رویا، زمین روئی۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کا سر نوکِ نیزہ پر اور جس کے اہلِ حرم کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام تک نامحرموں کے مجمع میں تشہیر کیے گئے۔ باپ کا مرثیہ اور زین العابدینؑ کی زبانی، دربار میں ہلچل ہوئی، لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ یزیدؒ کو خوف ہوا کہ کہیں انقلاب نہ آجائے۔ یزیدؒ جانتا تھا کہ اس وقت اگر امام کو خاموش کر سکتا ہوں تو بس اللہ کے نام کے ذریعہ۔ لہٰذا مؤذن کو حکم دیا کہ اذان شروع کر دے۔

مؤذن نے اذان شروع کی، امام نے خطبہ روکا۔ بس عزادارانِ حسینؑ، زحمت دے چکا۔ مؤذن نے کہا اَللہُ اَکْبَر امام نے بھی فرمایا "اَللہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا" مؤذن نے کہا اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ امام نے بھی شہادت توحید دی۔ مؤذن نے کہا اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ۔ اب امام نے رُخ کیا یزیدؒ کی طرف "یزید یہ اذان میں تیرے جد کا نام لیا جا رہا ہے یا میرے جد کا؟ ارے! کیا انصاف یہی ہے کہ رسولؐ کا نام اذان میں لیا جائے اور آلِ رسولؐ کو قید کر کے شہر بہ شہر دیار بہ دیار پھرایا جائے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

مجلس پنجم

أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ اللَّعِينِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدٍ وَّ اَهْلِبَيْتِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ وَهُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِيْنَ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ ۝

"نبی مومنین ۔ کے نفسوں سے بڑھ کے ہے اور ازواجِ نبی مومنین کی ماں ہیں اور جو صاحبانِ قرابت ہیں مومنین میں سے اور مہاجرین میں سے، وہ بعض اولیٰ ہیں بعض سے، یہ لوحِ محفوظ کا حکم ہے"

آیت کا ترجمہ اسی قدر تھا جو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ ہر امر میں آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ یہ آپ کی عزت افزائی ہے جو میں کہہ دوں "یہ سُنیئے یہ ملاحظہ فرمائیے" ورنہ میں کہاں اور یہ طرزِ ادا کہاں، یہ طریقۂ خطاب کہاں۔ خدا نہ لائے وہ دن جب میں اپنے دماغ میں سمجھوں کہ آپ کی عنایت نہیں بلکہ میرا حق ہے کہ میں اس منزل پر قبضہ کروں جو اس وقت میری نشست گاہ ہے ہرگز نہیں، میں یہی

حدود کو جانتا ہوں، میں اپنی منزل کو سمجھتا ہوں۔ نہ اس قابل کہ منھ کھولوں، نہ اس لائق کہ کچھ کہوں پھر وہ بھی تفسیر آیت، جہاں زبانیں روک دی گئی ہیں، میری نہیں بلکہ بڑوں بڑوں کی، یہ کہہ کے کہ مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْیِہٖ اَکَبَّہُ اللّٰہُ فِی النَّارْ "جو قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے گا خدا اسے منھ کے بھل آگ میں ڈال دے گا"۔ گو مجھے معلوم ہے کہ الفاظ کے معنی کہنا تفسیر آیت نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ ظاہر قرآن سے استدلال کرنا تفسیر آیۃ نہیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ حکمت خیز کلام میں برأیہ کی قید لگا کے بتا دیا ہے کہ معنی لغوی اور قواعد صرف کے اعتبار سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہو وہ مستثنیٰ ہے، یہ سب کچھ ہے مگر میں کیا جانوں کہ لغت میں معنی کیا ہیں، مجھے کیا معلوم کہ صرف کے قواعد کتنے ہیں، میں نہیں جانتا کہ نحو کے تمام کُلّیے کس قدر ہیں، مگر خیر جو کچھ سابقین کہہ گئے ہیں وہ لاحقین کا سرمایۂ کلام ہے۔ جو کچھ سلف صالحین جمع کر گئے ہیں وہ خلف کے تکلّم کا وسیلہ ہے۔ باتیں وہی ہیں جو کتابوں کے سربند خزانے چھپائے ہوئے ہیں، مجھے نہیں معلوم اور نہ میں کہتا ہوں، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ آیت محض میراث کا حکم بیان کر رہی ہے یعنی پہلا ٹکڑا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ "نبی مومنین کے نفسوں سے بڑھ کر ہے"۔ یہ تو مخصوص ہے نبی سے یعنی اس میں میراث کا کوئی ذکر نہیں۔ بہت بہتر! یوں ہی دوسرا حصہ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّہَاتُہُمْ "اور نبی کی بیویاں امت کی مائیں ہیں"۔ یہ بھی مخصوص محض ازواج سے۔ اسے بھی میراث سے ربط نہیں، یہ بھی منظور! اب آیت آگے بڑھی تو پہلا سلسلہ چھوڑتی ہوئی۔ یعنی پہلا حصہ رسولؐ سے مخصوص، دوسرا اُنکا وہ بھی انھیں کے ازواج کا بیان۔ مگر جہاں سے قرابت داروں کا

ذکر ہوا وہیں سے آیت نے دامن کھینچا۔ اجی! خود آیت کیوں دامن ہٹاتی، مگر خیر یا تو آیت خود الگ ہوئی اور یا کسی اور نے ہٹایا مگر کہا گیا یہ کہ "قرابت داروں سے مراد عام عزیز، یعنی کسی کے عزیز ہوں کوئی ہوں وہ بعض بعض سے اولیٰ ہیں۔"

خیر ہم نے یہ بھی مانا کہ آیت میں رسولؐ کا ذکر تھا، رسولؐ کی بیویوں کا تذکرہ تھا مگر رسولؐ کے خاص عزیزوں کا ذکر نہ تھا۔ بہت اچھا! ہم نے بھی مانا کہ رسولؐ کے خاص عزیزوں کا ذکر نہ تھا، بلکہ آیت صرف یہ کہہ رہی ہے کہ تمام مہاجر اور تمام مومن اور اُن کے اعزا بعض بعض سے میراث پانے میں اولیٰ ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کلیہ ہوا؟ کہ کوئی بھی ہو جو اُس کے عزیز ہوں گے اُن میں سے بعض کو فضیلت ہے۔ اور جب یہ کلیہ ہوا تو رسولؐ کے عزیز وہ بھی داخل، جس طرح عام مومنین کے رشتہ دار اولیٰ، اسی طرح رسولؐ کے رشتہ دار وہ بھی اولیٰ، اب تو کلام نہیں۔

یعنی ہم یہ کہتے تھے کہ آیت بیان کر رہی ہے صرف قرابت داران رسولؐ کا، آپ نے فرمایا نہیں بلکہ ذکر کرتی ہے ہر مومن کے اعزا کا۔ تو پھر رسولؐ کے عزیز وہ بھی داخل۔ جس طرح آپ اپنے قرابت داروں کی میراث پانے میں افضل اسی طرح رسولؐ کے عزیز اُن کی میراث پانے میں افضل، تو پھر دیجیے حق سیدہؑ کو، کیوں محروم کیا؟ اگر آیت خصوصیت کے ساتھ نہ تھی تو عام تو تھی۔ مگر نہیں پہلے خاص آیت کو عام کیا، پھر عام حکم میں تخصیص کی کہ رسولؐ کے عزیز خارج۔ آپ دیکھتے ہیں یہ انصاف ہے کہ جب دیکھا کہ رسولؐ کے عزیز اب بھی اولیٰ تو روایت پیش کی نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نَرِثُ وَلَا نُوْرِثُ "ہم گروہ انبیا نہ وارث ہوتے ہیں نہ وارث کرتے ہیں۔"

یعنی ان تمام گھماؤ سے مطلب یہ تھا کہ رسول زادی محروم رہے۔ اور عجب مزے کی بات ہے

کہ نہ رسولؐ نے سیدہؑ سے بتایا کہ بیٹی تم میری وارث نہیں ہو نہ مانگنا، نہ حسنؑ و حسینؑ سے فرمایا کہ بچوں ماں کے ساتھ گواہی دینے نہ جانا، نہ علیؑ کو بتایا کہ زوجہ کی طرف سے گواہی نہ دینا، مگر بتایا تو صرف ایک شخص کو سیدہؑ مانگے مگر تم نہ دینا۔ مشہور مثل ہے اَهْلُ الْبَيْتِ اَدْرٰى بِمَا فِي الْبَيْتِ "گھر والے زیادہ واقف ہوتے ہیں کہ گھر میں کیا ہے" لیکن بنت رسولؐ کو یہ تک نہ معلوم تھا کہ میں باپ کی وارث نہیں ہوں۔

اچھا تو پھر یہ کہہ دیجیے کہ سیدۂ عالم کو معلوم تھا مگر معاذ اللہ دولت کی لالچ سے چلی آئی تھیں اور علیؑ و حسنؑ و حسینؑ بھی جانتے تھے مگر العیاذ باللہ اپنا نفع تھا تو گواہی دے دی۔ کہیے نا کوئی ایک زبان، کہ سیدہ کا دعویٰ غلط تھا اور علیؑ کی گواہی جھوٹ تھی؟ مجھے ایک زبان نہیں ملتی جو یہ کہہ سکے۔ تو پھر؟ کہا جاتا ہے کہ سیدہؑ بھی سچی اور نہ دینا بھی حق" کیوں کہ "ہر دعوے کے گواہ ضروری ہیں، اگر گواہ نہ ہوں تو ثبوت شرعی مفقود ہے۔ اور یہاں سیدہ کا دعویٰ یا تو عدم علم سے تھا، رسولؐ کی حدیث جانتی نہ تھیں اور یا سچا تھا مگر گواہ نہ تھے کیوں کہ حسنؑ و حسینؑ بچے تھے اُن کی گواہی مقبول نہیں" مجھے آپ سے عرض کرنا ہے کہ ہمارے رسولؐ کے نواسوں کی گواہی ناقابل قبول تھی کیوں کہ بچے تھے اور حضرت یوسفؑ کی بے جرمی پر بچے کی گواہی مان لی گئی جو گہوارے میں تھا۔ نکال دیکھیے قرآن سے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ "گواہی دی اُس زلیخا کے عزیز نے جو گہوارے میں تھا کہ اگر یوسفؑ کا کرتا سامنے سے پھٹا ہو تو بے شک زلیخا سچ کہتی ہے اور یوسفؑ جھوٹے ہیں اور اگر چاک دامن پشت پر ہو

تو یوسف سچ کہتے ہیں زلیخا جھوٹی ہے"۔ بتائے مجھے کوئی کہ چار مہینے کے بچے کی گواہی قبول کرلی گئی بلکہ اس قابل ہوئی کہ قرآن میں لکھ دی جائے، مگر حسنینؑ کی گواہی رد کردی جائے کہ بچے ہیں، خیر حسنینؑ تو یوں الگ کہ بچے تھے۔ اور بھئی علیؑ۔ جی وہ بھی۔ اس لیے نہیں کہ جھوٹ بولے، بلکہ اس لیے کہ جب دعوے کے نفع میں گواہ شریک ہو تو شریعت حکم دیتی ہے کہ اس کی گواہی غیر معتبر، لہٰذا اگر سیّدہ کو مل جاتا تو علیؑ کا نفع تھا اس لیے اُن کی شہادت رد کی گئی"۔ باقی رہیں امِ ایمن تو ان کی گواہی قابل اعتبار سہی مگر وہ عورت تھیں اور صرف ایک۔ بہر حال سیّدہ کا دعویٰ ثابت نہ ہوا اس لیے رد کیا گیا۔

لیکن غور طلب ہے یہ امر کہ گواہی ہو یا قسم، شریعت میں معین کیوں کیا گیا، صرف اس لیے تاکہ مدعی کی صداقت کا یقین ہو جائے اور یہاں یہ مسلم کہ دعویٰ سچا تو پھر گواہ ہوتے یا نہ ہوتے یقین تو تھا کہ سیّدہ سچ کہہ رہی ہیں اور جب یقین تھا تو پھر گواہ کی طلب تحصیل حاصل تھی۔ اس کے علاوہ، بچوں کی گواہی معتبر نہیں، کیوں؟ محض اس لیے کہ کم عقل ہیں یا اس لیے کہ تکلیف شرعی متعلق نہیں۔ اگر جھوٹ بولے تو گناہ نہیں۔ اور جب وجہ یہ تھی تو اب دیکھ لیجیے کہ یہ دونوں وجہیں حسنینؑ میں تھیں یا نہیں۔ کہے نا کوئی کہ بچے کم عقل تھے۔ اجی وہ شاہزادے جو زمین سے بیٹھ کے لوحِ محفوظ کی عبارت پڑھیں انھیں کہے کوئی کہ کم عقل تھے! اچھا یہ نہ سہی تو یہ کہیے گا کہ غیر مکلف تھے جھوٹ بولنا گناہ نہ تھا تو میں عرض کروں گا کہ مہربانی کرکے ایک ہی موقع ایسا دکھا دیجیے کہ جب بچوں نے کوئی گناہ کیا ہو۔ اجی تو بہ! گناہ نہیں، کوئی بُری بات کی ہو۔ اور جب یہ نہیں تو جو وجہ تھی بچوں کے قول پر اعتبار نہ کرنے کی وہ نہیں، اور جب وجہ نہیں تو گواہی معتبر

تھی اسی طرح جس طرح بڑوں کی شہادت۔ اچھا اب اس پر بھی غور کہ علیؑ کی شہادت کیوں نہ مانی؟ یہی نا کہ دعوے کے نفع میں وہ شریک اور ایسے شخص کی گواہی معتبر نہیں۔ تو سوال ہوتا ہے کہ کیوں معتبر نہیں؟ اس لیے نا کہ ممکن ہے کہ محض اپنے نفع کے خیال سے گواہی دی ہو اور جب وجہ یہ نکلی تو بتائیے ہم کو کوئی ایسا مقام جب علیؑ نے نفع دُنیا کا خیال کیا ہو۔ اجی! اور اصحاب جو مالِ غنیمت لے لیتے تھے اُن کی دولت لاکھوں تھی مگر علیؑ جن کا حصہ خمس میں بھی، غنیمت میں بھی اُن کے گھر میں فاقے ہوں۔ کیا دُنیا کا نفع ڈھونڈھنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اجی! جس نے مزدوری کر کے، مشقت کر کے ایک ہزار غلام خریدے اور راہِ خدا میں آزاد کر دیے اُسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ نفع دُنیا کا طالب تھا؟ معاذ اللہ! اُسے مال کی لالچ تھی اُسے دولت دُنیا کی طمع تھی اور جب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تو علیؑ کی گواہی گو وہ سیّدہؑ عالم کے شوہر سہی! مگر قابلِ قبول تھی اور ضرور تھی۔

بہر حال یہ جواب اُس وقت تھا کہ جب یہ کہا جائے کہ گواہ نہ تھا اس لیے دعویٰ خارج ہوا، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ سب سچ تھا مگر حدیثِ رسولؐ روک رہی تھی تو میں عرض کروں گا کہ سیّدہؑ کو نہ معلوم تھی حدیث نہ سہی، حسنینؑ کو نہ معلوم تھی حدیث نہ سہی مگر علیؑ بھی ناواقف تھے اُنھیں بھی نہ معلوم تھا؟ اگر سیّدہؑ سے رسولؐ نے نہ بتایا تو علیؑ نے تو کہا ہوتا کہ اُم الحسنینؑ! کہاں جاتی ہو، تمھارے باپ تم کو محروم کر گئے ہیں، تمھارا حصہ نہیں ہے۔ کوئی کہے نا کہ سیّدہؑ کو علیؑ نے روکا تھا۔ اجی کون کہہ سکتا ہے روکنا کیسا علیؑ تو گواہ بن کے آئے تھے۔ لہٰذا اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف یہی کہ حدیثِ رسولؐ سے علیؑ بھی ناواقف تھے۔ کون علیؑ، وہی جن کے متعلق رسولؐ کی متفقہ حدیث ہے

اَقضَاکُمْ عَلِیٌّ " تم سب میں بہترین فیصلہ کرنے والا علیؑ ہے جیسا وہ حکم کرسکتا ہے کوئی ایک نہیں کرسکتا "۔ تو جناب کیا قاضی کو حکومت کرنے والے کو میراث کے احکام معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا میراث میں اس حکم کا معلوم ہونا لازم نہ تھا کہ رسولؐ کی میراث بٹ نہیں سکتی، اور اگر ضرورت تھی کہ جو قاضی ہو وہ میراث کے احکام بھی جانے تو علیؑ ضرور جانتے تھے کہ میراث کا حکم کیا ہے۔ کون محروم اور کون وارث۔ لہذا یہ ناممکن ہے کہ حدیثِ رسولؐ ہوتی اور علیؑ نہ جانتے۔ اس کے علاوہ یہ تو مسلم ہے کہ رسولؐ کوئی بات نہ کرتے تھے مگر اس وقت جب وحی اُترے، وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی " رسولؐ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے جب تک وحی اُتر نہ لے "۔ یہ بحث الگ ہے کہ آیت خاص ہے نطق سے، عمل اس سے خارج ہے۔ وہ فعلِ رسول خارج ہو معنیٔ آیت سے، یا داخل ہو اس سے بحث نہیں۔ مجھے مطلب حدیث سے ہے اور یہ مسلم کہ قولِ رسولؐ حکمِ آیت میں ضرور داخل ہے۔ جب یہ طے ہو گیا تو ماننا پڑے گا کہ رسولؐ کی حدیث یعنی ہم نہ وارث کرتے ہیں نہ وارث ہوتے ہیں، خدا کا بھیجا ہوا حکم تھا اور وحی کا سمجھایا ہوا حکم تھا تو علیؑ کو نہ معلوم ہونا ناممکن ہے، اس لیے کہ کوئی بات ہو، کوئی حکم ہو، کوئی آیت ہو علیؑ اس سے ضرور واقف تھے۔ خود آپ کا قول تھا کہ " میں قرآن کے ہر ہر لفظ سے واقف، ہر ہر معنی سے واقف، تاویل سے واقف، تفسیر سے واقف، تو کیا یہ ممکن ہے کہ جو اس طرح قرآن کا عالم ہو وہ یہ نہ جانتا تھا کہ آیۂ میراث اغیار کے واسطے ہے رسولؐ اس سے خارج ہیں۔ سب کچھ جانتے تھے علیؑ مگر یہ نہ جانتے تھے!! عجب بات ہے جو اگر قابلِ قبول ہو تو مان لیجیے۔ جب علیؑ خلافت ملنے کے بعد کوفے تشریف لائے تو چالیس دن ہر نمازِ صبح میں

آپ نے ایک ہی سورے کی تلاوت کی، دشمنوں کو موقع مل گیا کہا معلوم ہوتا ہے کہ
علیؑ کو قرآن یاد نہیں۔ اگر اور کوئی سورہ یاد ہوتا تو روز ایک ہی سورہ نہ پڑھے جاتے
یہ خبر علیؑ کو ہوئی۔ آپ نے ارشاد کیا وَیْلَکُمْ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ نَاسِخَہٗ وَمَنْسُوْخَہٗ
وَمُحْکَمَہٗ وَمُتَشَابِہَہٗ وَفَصْلَہٗ مِنْ وَصْلِہٖ وَحُرُوْفَہٗ مِنْ مَعَانِیْہِ
"وائے ہو تم پر مجھے قرآن نہیں یاد، ارے مجھی ہیں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ ناسخ کیا ہے
منسوخ کیا ہے، محکم کیا ہے، متشابہ کیا ہے، فصل کہاں کرنا چاہیئے، وصل کہاں
ضروری ہے، حروف کیا ہیں معنی کیا ہیں"۔ وَاللّٰہِ مَا حَرْفٌ نَزَلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ
اِلَّا وَاَنَا اَعْرِفُ فِیْمَنْ نَزَلَ وَاَیَّ یَوْمٍ نَزَلَ وَفِیْ اَیِّ مَوْضِعٍ نَزَلَ
یہ ہے محلِ استدلال، آپ ارشاد کرتے ہیں کہ "خدا کی قسم" یعنی ایک تو صادق ترین
ناس کا قول اور پھر قسم کے ساتھ وَاللّٰہِ مَا حَرْفٌ نَزَلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ "خدا کی قسم!
ایک حرف بھی میرے بھائی پر ایسا نازل نہیں ہوا جسے میں نہ جانتا ہوں کہ کس کے
بارے میں نازل ہوا اور کس دن نازل ہوا اور کس جگہ نازل ہوا"۔ فرماتے ہیں
امیر المومنینؑ کُنْتُ اِذَا سَئَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ اَجَابَنِیْ وَاِذَا فَنِیَتْ
مَسَائِلِیْ اِبْتَدَأَنِیْ "یعنی جب میں رسولؐ سے پوچھتا تھا تو وہ بتاتے تھے اور جب
میرے مسئلے ختم ہوجاتے تھے تو خود بتانا شروع کردیتے تھے"۔ کوئی آیت رسولؐ پر نہ دن کو
نازل ہوئی نہ رات کو، نہ آسمان پر نہ زمین پر، نہ دنیا کے بارے میں نہ آخرت کے بارے میں
نہ جنت کے بارے میں نہ نار کے بارے میں نہ نرم زمین پر نہ سخت زمین پر، نہ روشنی میں
نہ تاریکی میں مگر یہ کہ وہ آیت رسولؐ نے پڑھائی مجھ کو اور اس کی تاویل بتائی، تفسیر
بتائی، محکم بتایا، متشابہ بتایا، خاص بتایا، عام بتایا، یہ بتایا کہ کیونکر اتری،

یہ بتایا کہ کہاں اُتری، یہ سمجھایا کہ اب سے اور قیامت تک کون کون لوگ اس کے مصداق ہیں۔" وَدَعَی اللّٰہُ لِیْ اَنْ یُّعْطِیَنِیْ فَہْمًا وَّحِفْظًا فَمَا نَسِیْتُ اٰیَةً مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَلَا عَلٰی مَنْ نَزَلَتْ اور پھر بتا دینے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خدا سے دُعا بھی کی کہ "پروردگارا! علیؑ کو فہم دے اور حافظہ دے۔ یہ اس دُعا کا اثر ہے کہ میں کتاب خدا کی کوئی آیت کبھی نہیں بھولا اور نہ یہ بھولا کہ آیت میں کس کا ذکر ہے۔" اب بتائیں انصاف والے کہ جس کو رسولؐ نے یوں تعلیم دی، یوں پڑھایا، اس طرح سکھایا، اگر کہوں غلط نہ ہوگا کہ منتیں مان مان کے پڑھایا، دعائیں کر کر کے پڑھایا۔ کبھی یہ دعا کہ میرے خالق! علیؑ کو فہم دے، کبھی یہ دعا کہ حافظہ دے، کبھی یہ دعا کہ اس کے سینے کو علم سے بھر دے۔ ایسا شاگرد اُسے سب کچھ بتایا مگر یہ نہ بتایا کہ انبیاء کی میراث بٹتی نہیں۔ آپ کہیں کہ علیؑ نے یہی تو کہا قرآن کی کوئی آیت نہیں جو رسولؐ پر اُتری ہو اور رسولؐ نے مجھے بتائی نہ ہو تو اس سے یہ کہاں لازم کہ سب کچھ بتایا۔ تو میں عرض کروں گا کہ ہاں، ہاں! جب قرآن بتایا تو سب کچھ بتایا! لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ "کوئی خشک ہے نہ کوئی تر ہے جو کتاب خدا میں ہو نہیں۔" لہٰذا جس کو کتاب خدا کا علم اُس کو ہر شے کا علم۔ کوئی شے الفاظ کے ضمن میں معلوم، کوئی شے علم باطن میں معلوم، بعض اشیاء تفسیر سے معلوم، بعض اشیاء تاویل سے معلوم۔ اور اس کے علاوہ علیؑ نے یہ بھی تو کہا کہ رسولؐ نے مجھ کو یہ بھی بتایا کہ عام کیا ہے اور خاص کیا۔ تو اگر آیت میراث خاص ہوتی تو رسولؐ نہ بتاتے کہ یہ خاص ہے؟ اور پھر ایک مقام پر نہیں، کہیں یہ آیت کہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ "صاحبانِ قرابت بعض بعض سے اولیٰ ہیں" کہیں

لڑکی کی میراث بیان کرتے ہوئے وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ
"اور اگر کسی کے ایک ہی لڑکی ہو تو اُس کو فریضے کے اعتبار سے نصف متروکہ ملے گا"
اور اگر کوئی وارث نہ ہوگا تو باقی بالرد ملے گا۔ یہ مسلّم ہے کہ ان آیات میں حکم عام تھا
کسی کی تخصیص نہیں، جو بھی مرجائے اور قرابت دار موجود ہوں تو وہ وارث ہوں گے
اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اپنے باپ کی وارث ہو گی۔ لہذا رسولؐ نے ہر آیت
بتائی کہ یہ خاص ہے یہ عام ہے مگر یہ نہ بتایا کہ علیؑ! یہ اوروں کی لڑکیوں کا ذکر ہے
میری بیٹی نہیں!! زید عمر بکر کی لڑکی ہوگی تو آیت کے حکم کے مطابق میراث لے
جائے گی مگر فاطمہؑ، وہ میری میراث نہ پائے گی!! یہ کچھ نہیں، کون عاقل اسے قبول
کرے گا کہ یہ سچ ہے۔ بھئی کچھ نہیں مصلحت تھی حاکم وقت کی کہ نہ ملے میراث، تو نہ ملی۔
لیکن یاد رہے کہ احکام میراث بیان کرکے قرآن چپ نہیں ہو گیا بلکہ آخر میں یہ بھی
کہہ دیا کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ "یہ خدا کی معین کی ہوئی حدیں ہیں"۔ جو اطاعت
کرے گا جنّت میں جائے گا وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ
يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا "اور جو خدا و رسولؐ کی نا فرمانی کرے گا اور خدا کی
بتائی ہوئی حدوں سے بڑھ جائے گا تو خدا اُسے آگ میں ڈالے گا ہمیشہ کے واسطے"
آیت نے سزا بتائی اور تعمیم کے ساتھ۔ جو نافرمانی کرے کوئی بھی ہو، مومن ہو کافر ہو،
عالم ہو جاہل ہو، صحابی ہو تابع ہو، جو نافرمانی کرے گا يُدْخِلْهُ نَارًا "خدا
اسے جہنّم میں داخل کرے گا"۔

یہ ایک طریقہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ سیّدہ کو میراث پدر نہ دینا، فدک نہ دینا
بے وجہ تھا اور دوسرا طریقہ وہ تھا جو علیؑ نے بتایا اُس وقت جب سیّدہؑ عالم مسجد رسولؐ

میں تشریف لائیں اور ایک خطبۂ فصیح و بلیغ پڑھا اور آخر میں اپنے وارث رسولؐ ہونے پر دلیلیں پیش کیں۔ خطبہ بہت طویل ہے اور ہر ہر لفظ بتاتی ہے کہ معدن فصاحت کا بے مثل جوہر ہے۔ مہاجرین و انصار میں شور گریہ بلند ہوا اور رسول زادی محروم واپس ہوئی۔ چونکہ دلیلیں قوی تھیں اس وجہ سے لوگ مائل ہو گئے اور آپس میں سرگوشیاں شروع کیں۔ خلیفۂ اول نے دیکھ لیا اور رونق افروزِ منبر ہوئے اور دل کا تمام بخار علیؑ پر نکالا کہ یہ ان ہی کی حرکت ہے کہ عورتوں کے ذریعہ سے حق طلب کرتے ہیں اور بعض نا سزا الفاظ شان علیؑ میں کہہ ڈالے۔

امیرالمومنینؑ کو خبر پہنچی اور آپ نے پہلے تو اُس خطبے کا جواب تحریر سے دیا اور پھر مسجد میں تشریف لائے۔ تمام مہاجرین و انصار کا مجمع تھا اور خلیفۂ اول موجود تھے۔ حضرت متوجہ ہوئے خلیفہ کی طرف اور فرمایا "کیوں! یہ سیدہؑ کو اُن کا حق کیوں نہ دیا؟" جواب ملا کہ "فدک مال غنیمت تھا جس میں مسلمین کا حق ہے، اگر سیدہؑ گواہ دیں کہ رسولؐ نے فدک اُن کو دیا تھا تو میں دے دوں"۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ "کیا حکم خدا کے خلاف حکم کرو گے؟" جواب ملا کہ "ہرگز نہیں" آپ نے ارشاد کیا کہ "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں کسی ایسے مال کا دعویٰ کروں جو کسی مُسلم کے قبضے میں ہو تو گواہ کس سے مانگو گے؟ مجھ سے یا اُس سے؟" جواب ملا کہ "نہیں، اُس کا قبضہ کافی ہے لہذا گواہ آپ سے طلب کیے جائیں گے"۔ حضرت نے فرمایا کہ "پھر سیدہ سے گواہ کیوں مانگے، کیونکہ رسولؐ کی زندگی میں اور اُن کے بعد بھی قبضہ فدک پر سیدہ ہی کا تھا لہٰذا قبضہ کافی ہے، گواہ کی ضرورت نہیں"۔ یہ سُن کر خلیفۂ اول خاموش ہوئے اور خلیفۂ ثانی بولے کہ "علیؑ! یہ کچھ نہیں، اگر تمھارے پاس گواہ ہوں تو پیش کرو، ورنہ دعوے سے ہاتھ دھو"۔ ایمان والو! یہ تھا

انصاف، اور یہ تھا حکم خدا جو علیؑ کے واسطے بدل دیا گیا۔ حضرتؑ نے اُن کو کچھ جواب نہ دیا اور پھر متوجہ ہوئے خلیفہ اوّل کی طرف۔ اور فرمایا کہ "تمھیں معلوم ہے کہ آیۂ تطہیر کس کے واسطے نازل ہوئی؟" جواب دیا کہ "آپ اور سیدہ اور حسنینؑ کے واسطے"۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ "اچھا اگر کوئی سیدۂ عالم پر گناہ کی تہمت لگائے تو کیا کرو گے"۔ جواب ملا کہ "اور عورتوں کی طرح ان کو بھی سزا دوں گا"۔ فرمایا کہ "اگر سزا دو گے تو کافر ہو گے"۔ کہا "یہ کیونکر؟" فرمایا "یہ اس طرح کہ خدا کہتا ہے کہ سیدہ پاک ہیں اور ہم نے پاک کیا، اور تم نے خدا کے مقابلے میں لوگوں کی گواہی قبول کی لہٰذا کافر ہوئے"۔ یہ سُن کر خلیفہ چُپ ہوئے اور حضرتؑ نے فرمایا کہ "فدک کا معاملہ یوں ہی ہے کیوں کہ تم نے اوروں کی گواہی قبول کر کے سیدہؑ کا دعویٰ جھوٹا سمجھا۔" گویا حضرتؑ کا مطلب یہ تھا کہ گواہ مانگتے ہو تو آیۂ تطہیر موجود جو کہہ رہی ہے کہ سیدہ سچ کہہ رہی ہیں اور خدا موجود جو کہہ رہا ہے کہ سیدہ جھوٹ نہیں بولتی ہیں۔ اگر اسلام ہے تو مانو، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی مخالفت کی اور خدا کی گواہی نہ مانی اس کے علاوہ رسولؐ کا قول ہے اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعیٰ عَلَیْہِ گواہ پیش کرنا مدعی پر لازم ہے اور قسم مدعا علیہ پر ہے"۔ اور سیدہ مدعا علیہا ہیں، کیوں کہ فدک پر قبضہ سیدۂ عالم کا تھا اور تم مدعی ہو لہٰذا حکم رسول کہتا ہے کہ تم گواہ دو اور سیدہ سے لو بھی تو قسم لو، حالانکہ تم سیدہؑ سے گواہ مانگتے ہو جو قولِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ گویا حضرتؑ نے ثابت کر دیا کہ اگر اہلبیتؑ کی مخالفت کی تو سب کی مخالفت ہوئی، آیۂ تطہیر کی مخالفت ہوئی تو یوں قرآن جھوٹا خدا کی گواہی غلط کہ سیدہ سچ کہتی ہے، یہاں انھیں جھٹلا دیا گیا، یوں خدا کی مخالفت ہوئی۔ رسولؐ نے فرمایا مدعی سے گواہ لو،

انھوں نے ۔ عا علیہا سے گواہ مانگے یوں رسول کی مخالفت ہوئی ۔

یہ ہے اتحادِ حقیقی کہ اگر ایک کی مخالفت کی تو سب الگ ہو اللہ الگ ، رسول الگ ، قرآن الگ ۔ علیؑ کا استدلال ختم ہوا اور تمام حاضرین مسجد نے رونا شروع کیا کہ بھئی سچ کہتے ہیں ۔ اور خلیفہ اُٹھ کے داخلِ خانہ ہوئے ۔ مگر اس سب کے بعد بھی سیّدہ محروم رہیں ۔ ابھی خلافت میں حق و باطل یہ دوسری بحث ہے مگر صرف بنت نبی کو محروم رکھنا خدا و رسولؐ سب کو چھوڑ دینے کی دلیل تھا ۔

اور جناب سُنا آپ نے یہ جو کچھ بھی کیا گیا فقط اس لیے تھا کہ اگر فضائل کے ساتھ دولت جمع ہوگئی تو قیامت ہوگی جانتے تھے لوگ کہ اہلبیت کی ہر فرد وہ ہے کہ عالم کا کوئی ایک بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ یہ امر تجربہ شدہ ہے اور ہزاروں مرتبہ کا کہ آخرت میں تو نہیں مگر دُنیا میں مال عیب پوش ہنر پاش ہے ۔ جو صاحبِ دولت ہیں اُن میں عیب بھی ہنر ہوجاتا ہے اور جو مفلس ہیں اُن کے ہنر بھی عیب نظر آتے ہیں ۔ سب سے بہترین شئے جو انسان کی فضیلت بڑھا سکتی ہے وہ علم ہے ، مگر مال نہ ہو تو کوئی رنج نہیں اگر تاجپہ جائے کہ اور فضائل ، وہ اگر ہیں تو ہوا کریں لیکن اگر افلاس ہے تو بے کار ۔ بہت سے عالم بے قدر ہوگئے صرف اس لیے کہ دولت ساتھ نہ تھی اور بہت سے کم علم اعلم ہوگئے صرف اس وجہ سے کہ مال مدد دے رہا تھا ۔ لہذا انھیں کی دولت کہ اہلبیتؑ کے فضائل وہ ہیں جو نہ دبائے سے دب سکتے ہیں نہ مٹانے سے مٹ سکتے ہیں ، نہ یہ ممکن کہ الگ کردیے جائیں ، نہ یہ ممکن کہ بدل دیے جائیں ۔ لہذا اگر ان فضائل کے ساتھ دولت شریک ہوگئی تو پھر عالم کی نگاہیں بابِ اہلبیت سے الگ کردینا ناممکن ہوگا ۔

یہ سوچ کر سب سے پہلے مال الگ کیا ۔ اور بھئی الگ کیا تو ہمیں غم نہیں یعنی

نہ اہلبیتؑ کو غم، نہ خادمانِ اہلبیت کو غم، وہ بھی خوش یہ کہہ کر کہ رَضِیْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِیْنَا ؛ لَنَا عِلْمٌ وَلِلْاَعْدَاءِ مَالٌ "ہم اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمارے واسطے علم ہے اور دشمن کے پاس مال"۔ اور جس طرح علم مال سے بہتر اور ایک نہیں چالیس طریقوں سے بہتر، جس کی شاہد وہ روایت جس میں مذکور ہے کہ علیؑ سے چالیس آدمیوں نے آ کے پوچھا کہ علم بہتر یا مال، اور آپ نے چالیس طریقوں سے ارشاد کیا کہ علم بہتر، اور جب سوال کرنے والے ختم ہو گئے تو ارشاد ہوا کہ اگر اب سے قیامت تک پوچھتے رہتے، ہر مرتبہ ایک نئی دلیل سے یہی کہتا کہ علم بہتر ہے مال سے۔

بعینہٖ اسی طرح صاحبانِ دولت سے صاحبانِ علم بہتر اور چالیس درجہ بہتر، بلکہ اس سے بھی زائد بلند۔ لہٰذا اہلبیتؑ بھی خوش کہ جو بہتر سے بہتر تھا وہ ہم کو ملا، اور ہم بھی خوش کہ اگر دولت ہوتی اور اس کے بعد دروازۂ اہلبیت پر ہماری پیشانی خم ہو جاتی تو اطاعت مبہم رہتی کہ خدا جانے دولت کی اُلفت تھی یا در اصل اہلبیتؑ کی محبت تھی۔ مگر جب غربت کے سوا کچھ نظر نہ آیا تو معلوم ہو گیا کہ اُلفت بے لوث ہے اور محبت خالص ہے۔

یہ نہ فرمائیے گا کہ جب دولت نہ ملنے کے بعد علیؑ خوش تھے تو پھر یہ مطالبہ کیوں تھا اور اظہارِ غم و غصہ کیوں تھا؟ میں عرض کروں گا کہ یہ اس لیے تھا کہ دنیا یہ نہ کہے کہ علیؑ کا حق تھا تو کیوں نہ مانگا؟۔ ابھی آج اتنا مانگنے کے بعد بھی دنیا کہہ رہی ہے کہ علیؑ اصحاب سے رنجیدہ نہ تھے، پھر جب وہ راضی تو تم کیوں خفا ہو؟ اس وجہ سے علیؑ نے بھی بتا دیا کہ میرا حق اور ہم بھی آج تک اظہار کر رہے ہیں تاکہ حق چھپنے نہ پائے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر ان حضرات کو جن کا نام تھا اہلبیتِ رسولؐ، کچھ بھی دنیا کی

آرزو ہوتی تو خدا کی قسم دُنیا کے خزانے اُنڈل پڑتے اور تمام زمین کے معدن خالی نظر آتے ان جواہرات کے آگے جو اہلبیتؑ رسُول کے پاس ہوتے۔ اگر ایک ذرا سا لب ہلا دیتے تو وہ اور ہوں گے جن کی دعائیں رَد ہوتیں یہ اہلبیت رسولؐ تھے جن کی آواز، رحمت کیسی عذاب تک کو کھینچ لاتی۔ یعنی وہ جس کی آواز عذاب کو بلا لے وہ اس سے زائد با اختیار ہے جس کی صدا رحمت کو کھینچ لے۔ کیونکہ خدا کی رحمت بہانہ تلاش کرتی ہے اور غضب سے آگے چلتی ہے لہٰذا رحمت کو متوجہ کر لینا آسان ہے مگر غضب بمشکل آتا ہے۔ جب رحمت ہٹتی ہے تب آتا ہے۔ اسی وجہ سے عذاب کو بلا لینا مشکل ہے۔ مگر اہلبیتؑ وہ تھے کہ جن کی دعائیں عذاب کے واسطے قابل قبول تھیں چہ جائے کہ رحمت کی دُعا۔ لہٰذا اگر دولت مانگ لیتے تو ناممکن تھا کہ دُعا رد ہو جاتی۔

بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ دعا کرنا اور شئے ہے زبان کو حرکت دینے کی بھی حاجت نہ تھی۔ وہ اور مقامات تھے جب دعا کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر دولت، اس کے واسطے تو دل کا ارادہ کافی تھا، نگاہ کا اشارہ بس تھا، ہاتھ کا لگ جانا کافی تھا۔ کبھی اگر دیوار کو دیکھ لیا تو سُونا ہو گئی۔ اور کبھی اگر پانی ہاتھ سے مل کے بہا تو طشت جواہرات سے بھر گیا۔

خیر یہ تو اُس وقت کا ذکر ہے جب یہ حضرات زندہ تھے۔ لیکن بعد شہادت بھی جو ذرّہ جسم سے مس ہو گیا وہ گوہر بنا۔ سب جانتے ہیں کہ آبِ نیساں کا فیض ہے جس کے قطرے بحرین میں گر کے دُرِ بے بہا بنے۔ لیکن اگر وہی ابرِ نیساں صحرا میں اپنا خزانہ اُنڈیل دے تو ایک موتی نہ بنے۔ معلوم ہوا کہ فیض ابر ہے جس کے قطرے گرنے مگر اُس وقت جب صدف اپنے سینے میں جگہ دے اور جب بحرین کا پانی پرورش کرے۔ اتنی

شرطیں جمع ہوں تب کہیں پانی کا قطرہ گہر بنے۔ لیکن خشکی میں موتی بنانا ممکن ہے اسی وقت جب جسمِ امام مَس ہو جائے، اگر پانی سے موتی بنے تو کیا فضیلت، فضیلت جب ہے کہ جب مٹی گہر بنے جیسے زمینِ نجف اور اس میں علیؑ کی قبر اور اُس کی مٹی دُرِ نجف۔ یہ تھا فیض کہ جو خاک جسم سے مَس ہوگئی وہ اتنی صاف ہوئی کہ دُر بنی یعنی ذلیل ترین شئے مٹی جب وہ دامنِ کفن سے مس ہو کے یوں پاک ہوئی تو انسان اگر گوشۂ دامن تھام لیتے تو پاکیزگی کی حد نہ رہتی کسی کی خاک خاکِ شفا بنی اور کسی کے قبر کا جوار گوہر ساز بنا۔

یہ تھے وہ لوگ جو فقر کے عالم میں زندگی گزار گئے۔ فرمایا کرتے تھے علیؑ کہ "تمام دُنیا میں ہمارے پاس ایک فدک رہ گیا تھا مگر وہ بھی چھن گیا۔ مگر رہا تو کیا اور نہ رہا تو کیا زمین قبر مل ہی رہے گی وہ کہیں ہو"۔ یہی استغنا تھا جس نے دُنیا کی طرف سے غافل کر دیا ورنہ اگر یہ چاہتے تو کیا نہ ہوتا۔

ایک دن کا تذکرہ ہے کہ امیرالمومنینؑ داخلِ خانہ ہوئے۔ ارشاد کیا "سیدہؑ! کچھ ہے گھر میں؟" عرض کیا یا ابا الحسنؑ اِنَّنِیْ مُنْذُ یَوْمَیْنِ اُعَلِّلُ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ "یا علیؑ میں تو کیا حاضر کروں، دو دن سے حسنؑ و حسینؑ کو بہلا بہلا کے رکھتی ہوں" حضرتؑ نے ارشاد کیا "سیدہ اپنی چادر دے دو کہ اسی کو رہن کر کے بچوں کے واسطے کچھ سامان کروں"۔ سیدۂ عالمؑ اٹھیں اور پیوند لگی چادر حاضرِ خدمت کی۔ حضرت وہ چادر لیے ہوئے ایک یہودی کے پاس آئے۔ فرمایا "اس چادر کو رہن کر کے ایک صاع جَو دے دو"۔ یہودی نے چادر رکھ لی اور جَو حاضر کیے۔ حضرت نے دامن پھیلا کے جَو لیے اور مکاں کی طرف واپس ہوئے۔ کچھ دُور چلے تھے کہ یہودی

نے آواز دی "یا علیؑ! ذرا ٹھہر جائیے مجھے کچھ کہنا ہے"۔ حضرت ٹھہر گئے۔ یہودی قریب آیا، عرض کیا "یا علیؑ! ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے"۔ فرمایا "پھر کیوں نہیں کہتا"۔ عرض کیا "یا علیؑ! آپ کے بھائی تو کہتے ہیں کہ میں خدا کا حبیب ہوں اور تمام انبیاء کا سردار ہوں تو پھر آپ اتنی مصیبت کیوں اٹھاتے ہیں، خدا سے دعا نہیں کرتے کہ خدا آپ کو غنی کر دے"۔ یہ سن کر حضرت نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور خاموش رہے۔ یکایک انگشتِ مبارک سے زمین کو چوٹ دی اور فرمایا اِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَوْ اَقْسَمُوْا عَلَيْهِ اَنْ يُحَوِّلَ هٰذَا الْجِدَارَ ذَهَبًا لَفَعَلَ "سنا تو نے کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر اسے قسم دے دیں کہ اس دیوار کو سونا کر دے تو ابھی ہو جائے"۔ اِدھر یہ فقرہ زبان سے نکلا اور اُدھر دیوار کا کثیف جو ہر صاف ہوا اور مٹی نے سونے کی صورت بدلی۔ حضرت نے دیکھا اور ارشاد کیا ما اَمَرْتُكَ اِنَّمَا ضَرَبْتُكَ مَثَلًا "ہیں! میں نے تجھے کب حکم دیا تھا کہ تو سونا ہو جائے میں نے تو صرف ایک بات کہی تھی"۔ اِدھر یہ حکم دیا اور اُدھر پھر دیوار خاک ہو گئی۔

یہ تھا اختیار کہ دعا نہیں، حکم نہیں، فقط اشارہ کافی تھا کہ معمولی مٹی طلائے خالص ہو جائے۔ اور پھر جناب اگر مٹی میں قابلیت ہو تو آفتاب کی تیز کرنیں اس مٹی کو سونا بنا دینے میں کیمیا کا کام دیتی ہیں گو وہ مدتِ مدید میں سہی، گو وہ معدن خاص میں سہی، مگر بن جاتا ہے سونا، اور صرف اس لیے کہ دستِ شعاع، زرگر تھا۔ یہی پھر جب آفتاب کی کرن طلا ساز ہو تو آفتابِ امامت بلند اُس سے۔ اُس نے بنایا سونا اور ایک خاص معدن میں مدتوں کے بعد اور علیؑ نے بنایا سونا، اور ہر مٹی کو جس پر نظر پڑ گئی۔ اور یہ نہ ہوتا کیوں؟ اس لیے کہ آفتاب ایک خادم تھا اور

وہ بھی اُدنیٰ، پھر جب اُس کی شعاع سونا درست کر سکی تو علیؑ کے چہرے کی ضو جو کچھ نہ کرتی وہ کم تھا۔

گو بہ ظاہر کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی قوت صبر کہ گھر کے بچّے فاقے کریں اور یہ بھی قدرت کہ مٹی کی دیوار سونا بن جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں نقطۂ قدرت میں پوشیدہ تھیں، یعنی یہ بھی اظہارِ قدرت تھا کہ صبر کیا، اور یہ بھی اظہارِ قدرت تھا کہ جو حکم دیا ہو کے رہا، یعنی یہ کم قدرت نہیں ہے کہ باوجود اتنے اختیارات کے فاقہ کیا اور صبر کیا، یعنی اپنے فاقے پر صبر یہ پھر کم ہے لیکن بچّوں کی بھوک اور اُس پر صبر یہ انتہائی قدرت تھی۔ مجھے دیکھنا ہے، کوئی ایسا ہے جس کو یہ اختیار ہو اور اس کے بعد بھی بچّے تڑپتے رہیں اور صبر کر جائے۔

ایسی ہستی اگر تاریخ میں کہیں مل سکتی ہے تو وہ سوائے اسی علیؑ کے فرزند کے اور کوئی نہیں۔ یہاں علیؑ نے بچّوں کو بھوکا دیکھا مگر کسی روایت سے معلوم نہیں ہوتا کہ علیؑ کے بچّے پیاسے بھی تھے۔ لیکن کربلا میں حسینؑ کے چھوٹے چھوٹے بچّے خالی کوزے ہاتھوں میں لیے ہوئے العطش العطش کی صدائیں بلند کر رہے ہیں اور حسینؑ مشیّتِ الٰہی پر صابر و شاکر بچّوں کی پیاس کو حسرت و یاس سے دیکھ رہے ہیں۔

اُدھر حسینؑ کا یہ عالم کہ حُر کے لشکر کو پیاسا نہ دیکھ سکے تو سوار اور گھوڑوں کو اپنی نگرانی میں سیراب کرا دیا، اور ادھر لشکرِ عمر سعد کا یہ عالم کہ حسینؑ فریاد کر رہے ہیں کہ "مسلمانو! میں تمھارے نبی کا نواسہ ہوں اور پھر تمھارا مہمان ہوں۔ دیکھو! میرا جگر شدّتِ تشنگی سے بھُنا جاتا ہے، اگر ایک جامِ آب دے دو گے تو یہ فرات کا

پانی کم نہ ہو جائے گا۔" اور جواب دیا جاتا ہے کہ "اے حسینؑ! یہ تمام روئے زمین پانی پانی ہو جائے تب بھی آپ کو ایک قطرہ نہ ملے گا جب تک آپ یزید کی بیعت نہ کر لیں۔"

کیا عمر سعد کے لشکر میں حرؑ کے رسالے کا کوئی سپاہی نہ تھا جو حسینؑ کے احسان کو یاد کرتا اور بے کس و مظلوم کو سیراب کر دیتا؟ اچھا خیر! حسینؑ سے لڑائی بھی اُن کو پانی نہ دیا تو نہ دیا مگر انصاف والو! بتاؤ کہ پردے میں بیٹھنے والی عورتوں نے کیا قصور کیا تھا، بچوں نے کیا خطا کی تھی؟ مگر ہمارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتے ہیں کہ نہ حسینؑ پر کسی کو رحم آیا، نہ حسینؑ کی عورتوں پر نہ حسینؑ کے بچوں پر۔

سیراب کرنا کیسا، اِن ملاعنہ کا دستور یہ تھا کہ جب بچے پیاس سے زیادہ تڑپتے تھے تو لشکر والے بچوں کو پانی دکھا دکھا کر زمین پر بہا دیتے تھے اور حسینؑ ان تمام مناظر کو دیکھتے تھے اور صبر کرتے تھے۔

یہ نہ سمجھیے گا کہ حسینؑ بے بس تھے۔ بخدا میرا یقین ہے کہ اگر مظلوم کے لب ہل جاتے تو گھٹائیں اُٹھ اُٹھ کر جل تھل کر دیتیں، اگر اشارہ کر دیتے تو فلک سے ستارہ گھسیٹ لینے والے ہاتھوں میں یہ طاقت بھی تھی کہ فرات کی موجیں سر پٹکتی ہوئی بے کس کے قدموں پر آ جاتیں، بخدا! اگر اسمٰعیلؑ میں یہ طاقت تھی کہ ایڑیاں رگڑیں تو پانی کا چشمہ پھوٹ پڑے تو فخر اسمٰعیلؑ میں بھی یہ دم تھا کہ ٹھوکر لگاتے تو زمین سے پانی اُبلنے لگتا۔

یہ سب طاقتیں تھیں مگر حسینؑ جانتے تھے کہ میں منزل امتحان میں ہوں

اس لیے بچوں نے سوال آب کیا، حسینؑ خاموش رہے۔ علی اکبرؑ نے جنگ سے واپس آکر سوال کیا تو فرمایا کہ جاؤ علی اکبر یہ انگوٹھی منھ میں لیتے جاؤ، اب تمھارے جد تم کو آب کوثر سے سیراب کریں گے۔ علی اصغر پیاس سے تڑپے تو حسینؑ بچے کو آغوش میں لے کر دشمن کے لشکر کے سامنے آگئے اور بچہ تیر ظلم سے سیراب کیا گیا۔ یہ سب صرف اس لیے کہ حسینؑ مشیّت الٰہی کے پابند تھے، وعدۂ طفلی کو نباہ رہے تھے۔

یہ تو حسینؑ تھے، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ حسینؑ کی گود کے پالے بچے وہ تھے جو رضائے الٰہی کے لیے اپنی تکلیفوں کو بھول جاتے تھے۔ ذرا یاد کیجیے وہ منظر، جب حسین رخصتِ آخر کے بعد خیمے سے باہر تشریف لائے ہیں۔ راہِ الٰہی کا مجاہد گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے سر کی قربانی پیش کرنے کے لیے آگے بڑھا تو چلتا ہوا گھوڑا اڑ کا۔ حسینؑ نے فرمایا، "میرے وفادار فرس! میں جانتا ہوں کہ تو بھوکا بھی ہے اور پیاسا بھی، مگر یہ میری آخری خدمتیں ہیں ان میں کوتاہی نہ کر۔" گھوڑے نے گردن سے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ حسینؑ نے دیکھا کہ چھوٹی بچی سکینہ گھوڑوں کے سموں سے لپٹی ہوئی ہے۔

اُترے حسینؑ۔ بچی کو گود میں اُٹھایا۔ سکینہؑ نے فرمایا، "بابا! کہاں جاتے ہیں۔" فرمایا "مرنے کو" کہا، "کیوں؟" فرمایا، "جس کا کوئی بچانے والا نہ ہو وہ مر نہ جائے تو کیا کرے۔"

بس اب بچی تڑپی، "بابا! آپ مرنے جاتے ہیں تو ہم کو ہمارے جد کے روضے پہ پہنچاتے جائیے۔" حسینؑ نے جواب دیا، "میری بچی! دیکھتی نہیں، فوجیں

چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں"۔ یہ سُن کر سکینہؑ نے آخری فرمائش کی، "بابا! ہم آپ کے بعد پانی کس سے مانگیں گے، ہم کو پانی پلاتے جائیے"۔ حسینؑ نے زمین پر ٹھوکر ماری۔ پانی کا چشمہ اُبلا۔ تین دن کی پیاسی بچی دوڑی، حسینؑ نے بازو تھاما۔ سکینہؑ! میں پانی پینے سے نہیں روکتا۔ لیکن اگر پانی پی لیا تو اُمت کو راہ نجات نہیں مل سکتی"۔ سکینہؑ نے فرمایا، "بابا! جائیے، خدا حافظ! میں پیاسی رہ جاؤں گی مگر اُمت کی ہلاکت منظور نہیں"۔

بس، عزادارانِ حسینؑ! زحمت دے چکا، اتنا اور سُن لیجیے کہ حسینؑ روانہ ہوئے سکینہؑ پلٹ کر خیمے میں آئیں۔ عصر کا وقت قریب آیا اور بچی حسبِ عادت باپ کے لیے مصلّےٰ بچھا کر بیٹھی۔ ایک مرتبہ درِ خیمہ پر حسینؑ کے اسپِ باوفا کی آواز سُنائی دی۔ جنابِ زینبؑ نے فرمایا، "جاؤ سکینہؑ جاؤ! دیکھو، شاید تمھارے بابا آئے ہوں"۔ سکینہؑ دوڑی ہوئی درِ خیمہ پر آئیں تو عجب منظر دیکھا۔ باگیں کٹی ہوئی، زین ڈھلا ہوا، پیشانی خون سے رنگین۔ "اے پھوپھی! زرا آکر دیکھیے میرے بابا کا گھوڑا کس شان سے آیا ہے"۔ "میرے باپ کے وفادار فرس! میرے بابا کو دشمنوں کے مجمع میں کیوں چھوڑ آیا"۔

مجلس ششم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ نَبِیِّنَا وَشَفِیْعِ الْمُذْنِبِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ وَاَھْلِبَیْتِہِ الْمَعْصُوْمِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَالَ اللّٰہُ الْکَرِیْمُ الرَّحِیْمُ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ط وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط

کلامِ الٰہی نے اپنے اختصار میں شانِ اعجاز یوں مضمر کی کہ بڑے بڑے علمی مضامین ایک ایک آیت میں مکمل کر دیے، بڑی بڑی آیتیں ایک ایک لفظ میں پوشیدہ کیں۔ ایک ایک لفظ کا مضمون ایک ایک حرف میں نظر آیا، اور ہر حرف سمٹ کے نگاہِ حقیقت شناس میں ایک ایک نقطہ بنا اور یہ تمام نقطے ابواب بنا کے اُن طیب و طاہر سینوں میں جمع کیے گئے جن کے متعلق کلامِ خدا کا ارشاد ہوا "کہ یہ قرآن تو ان لوگوں کے سینوں میں روشن آیتیں ہیں جن کو علم دیا گیا ہے" اگر خالقِ کلام اتنا اختصار مدِ نظرِ قدرت نہ رکھتا تو اتنی جامعیت کہاں سے آتی کہ دُنیا کا ہر خشک و تر، بلند و پست، ظاہر و غائب، ادنیٰ و اعلیٰ کتابِ خدا میں

جمع ہو جاتا، ہر قصہ ملتا، ہر حکم ملتا، ہر اصل موجود، ہر فرع موجود۔ تمام قاعدوں کا جامع، تمام قوانین پر مشتمل، نہ آخرت کی کوئی بات چھوڑی، نہ دُنیا کا کوئی مسئلہ ترک کیا۔ یہ بھی بتایا کہ تم کو عملی انسان بنانے کے لیے ہم نے کیا کیا پیدا کیا۔ تمھاری زندگی کو عملی بنانے کے واسطے ہم نے کون کون سی چیزیں فرماں بردار کر دیں۔ تم کو عملی تعلیم دینے کے واسطے ہم نے کس کس نبی کو کیا کیا سکھایا۔

سب سے پہلے جناب آدمؑ نے دُنیا میں قدم رکھا تو آپ نے گوسفند بھی چرائے کاشتکاری بھی کی، چکّی پیسی کھانا پکایا۔ جناب ادریسؑ نے تعلیم دینے پر توجہ کی تو علمِ نجوم، طبابت اور حکمت کو عام کر دیا، پھر عمارتیں بنانے پر توجہ کی تو اہرامِ مصر کی سی عجائبِ زمانہ عمارتیں بنائیں جن کو دیکھ کر آج تک عقلیں حیران ہیں اور اہرام کے ہر پتھر میں تمام کمالات اور تمام صنعت و حرفت کے اوزاروں کی تصویریں بنا دیں کہ دُنیا ان چیزوں کو بھولنے نہ پائے۔ اور لکھنا بھی آپ ہی نے سکھایا۔ جناب سلیمانؑ نے زنبیل بنائی۔ جنابِ لقمان نے طبابت و حکمت کے ساتھ ہی کپڑے بھی سیئے۔ جناب نوحؑ نے نجاری کی اور کشتی بنائی۔ جنابِ ابراہیمؑ نے معماری کی عمارتِ کعبہ بنائی۔ جناب اسمٰعیلؑ اور یوشعؑ اور جناب موسیٰؑ نے گوسفند چرائے۔ جناب شعیبؑ کے پاس گوسفند کثرت سے تھے، کہ اُن کا دُودھ اور اُون وغیرہ ان کی بسر کا ذریعہ تھے۔ جناب لوطؑ زراعت کرتے تھے۔ جناب صالحؑ سنگ تراشی کرتے۔ جناب یحییٰؑ کپڑوں کی مرمت کرتے تھے۔ جناب زکریاؑ کے باغات تھے۔ جنابِ عیسیٰؑ نے پہلے تو اٹھارہ برس تک نجاری کی اور اس کے بعد دُنیا کو رنگ سازی بتائی۔ جناب داؤدؑ نے زرہیں بنائیں۔ ہمارے رسولؐ نے قبلِ بعثت گوسفند چرائے، تجارت کی اور بعد رسالت اپنی نعلین کی مرمت

خود کرتے تھے، اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے تھے، کپڑا سیتے تھے اور فرماتے تھے عَمَلُ الْاَبْرَارِ مِنَ الرِّجَالِ اَلْخِيَاطَةُ "نیک مردوں کا بہترین کام خیاطی ہے"۔

جب حکومتِ الٰہی اس طرح اپنے بندوں کو انبیاء کے ذریعے سے تعلیم عمل دے چکی تو عملی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرنے، تنبیہ کرنے، اشارہ کرنے میں بھی کمی نہ کی، ارشاد ہوا اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ "ہم نے لوہا اور فولاد پیدا کیا جس میں بڑا خطرہ ہے اور انسان کے واسطے فائدے بھی ہیں" یعنی یہ لوہا لڑائی کے بھی کام آتا ہے اور دوسرے فائدے بھی ہیں۔ آپ ہی انصاف سے فرمائیں کیا اس آیت نے اشارہ نہیں کر دیا کہ میدانِ جنگ میں بھی تم اس لوہے سے ہزاروں کام لے سکتے ہو۔ توپیں بناؤ، بندوقیں، تلواریں بناؤ یا نیزہ، گولیاں بناؤ یا گولے، آہن پوش سواریاں بناؤ یا قلعہ، جو کام چاہو وہ میدانِ جنگ میں لے لو اور جو نفع چاہو وہ اس لوہے میں موجود ہے۔ ریلیں بناؤ یا تیغیں بناؤ یا ظروف بناؤ۔ بہر حال ہزاروں منفعتیں اسی ایک لوہے سے حاصل ہوں گی۔

پھر تانبے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ "ہم نے سلیمان کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کی نہر جاری کر دی جس سے انھوں نے ہزاروں چیزیں بنا ڈالیں۔ جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ "خدا نے چارپائے پیدا کیے جن سے تم کو جڑاول مل گئی اور بہت سے فائدے حاصل ہوئے اور اُن میں سے بعض جانور تمھاری غذا بھی ہیں اور انھیں میں تمھاری جاہ و حشم اور زینت و رونق کا سامان بھی ہے۔ اور جن جن مقامات پر تم بہ آسانی نہ پہنچ سکتے وہاں

پہنچنے کے واسطے راحت رساں سواریاں بھی ہیں"۔ اسی طرح بہت سی آیتیں جن میں اشارۃً کنایۃً یا صریحاً یہ بتایا گیا کہ جو کچھ ہے وہ انسان کے فائدے کے واسطے، اور جو چیز ہے اُس میں کچھ فائدے ضرور ہیں اور ان فائدوں سے کام لینے کے واسطے ہر شے کو خدا نے ہمارا فرماں بردار کر دیا۔

اس تعلیمِ قرآنی کے بعد ضرورت تھی کہ جو خدا کے نائب ہوں، دُنیا کے حاکم ہوں، حکومت الٰہیہ کے ارکان ہوں وہ اپنی زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کے بعد اپنے اقوال و احادیث کے ذریعے سے وہ عملی احکام اور ہدایت نامے چھوڑ جائیں جو ان حضرات کی رحلت کے بعد اور زمانۂ غیبت میں سرمایۂ عمل ہوں اور انسان کو عملی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔ لہٰذا کسی امام نے ارشاد کیا اَلْعِبَادَةُ سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَفْضَلُهَا طَلَبُ الْحَلَالِ "عبادت کے ستّر جز ہیں سب سے بہتر عبادت یہ ہے کہ انسان مالِ حلال پیدا کرنے کی کوشش کرے"۔ کسی معصوم نے یوں فرمایا اِنَّ الْعِبَادَةَ عَشَرَةُ اَجْزَاءٍ تِسْعَةٌ مِنْهَا طَلَبُ الْحَلَالِ "یوں سمجھو کہ گویا عبادت کے دس جز ہیں نو جز اُس کے یہ ہیں کہ انسان مالِ حلال پیدا کرے اور ایک جز میں تمام عبادات ہیں"۔ کبھی ارشاد ہوا اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ کَسْبُ الْحَلَالِ "کوئی ایسا پیشہ کرنا جو حلال ہو سب سے بہتر عمل ہے"۔ کبھی ارشاد فرمایا "مرد کے واسطے سب سے بہتر وہ چیز ہے جس کو اپنی محنت سے پیدا کرے"۔

ان تمام مقامات پر یا تو خطاب عام تھا جس میں مرد و عورت دونوں شامل تھے یا صرف مردوں کا تذکرہ تھا۔ اب اس کے بعد خصوصیت سے یہ بتایا گیا کہ عورت کیا کام کرے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "عَمَلُ الْاَبْرَارِ مِنَ النِّسَاءِ الْغَزْلُ"

"جو نیک عورتیں ہیں ان کا بہترین کام چرخہ چلانا ہے"۔ اس چرخے کو عورت کے واسطے جہاد فی سبیل اللہ سے بہتر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "عورت کے ہاتھ میں چرخہ اُس نیزے سے بہتر ہے جو کسی مرد کے ہاتھ میں ہو جو خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے"۔ خود ہمارے پیغمبر نے محنت و مشقت اور اپنی روزی اپنے ہاتھ سے پیدا کرنے کی طرف بلند سے بلند تعلیم دی اور ارشاد فرمایا کہ "جو شخص اپنے اہل و عیال کے واسطے محنت و مشقت کر کے مالِ حلال حاصل کرتا ہے وہ اُس شخص کے مثل ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے"۔

ارشاد فرماتے ہیں کہ "شبِ معراج میں نے کچھ قصر سب سے بلند دیکھے میں نے جبرئیل سے دریافت کیا کہ یہ کس کے قصر ہیں؟ امینِ وحی نے جواب دیا کہ یہ اُن لوگوں کے ہیں جو دارِ دُنیا میں اپنی معیشت اپنے ہاتھ سے پیدا کرنے میں زحمتیں اُٹھاتے تھے" امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں "بہترین ورع و تقویٰ یہ ہے کہ انسان رزقِ حلال پیدا کرنے میں کوشش کرے اور کسی سے سوال کرنے سے بچتا رہے"۔

اس سلسلے میں آخرِ کلام میں وہ حدیثِ پیغمبرؐ پیش کردوں جو اُن لوگوں کے واسطے تازیانۂ عبرت ہے جو کہتے ہیں اللہ رازق ہے اُس نے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" "جو شخص تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے گا تو خدا ہر مصیبت میں اُس کے واسطے کوئی نجات کی صورت نکال دے گا اور اُس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جس کا اُس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا"۔ روایت میں ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو اصحابِ پیغمبر میں سے کچھ لوگوں نے ہر کام چھوڑ کے مسجد میں

گوشہ نشینی اور عبادت شروع کردی کہ خدا تو وعدہ ہی کرچکا ہے، ضامن رزق ہے، تقویٰ اور پرہیزگاری ہمارا کام ہے روزی دینا اُس کے ذمّے ہے۔ خیر، یہاں تک غنیمت تھا کہ کاروبار چھوڑ کے عبادت تو شروع کی، تقویٰ اور پرہیزگاری تو اختیار کی۔ مگر وائے بر حال ما! ہم نہ عبادت کرتے ہیں، نہ متقی بنتے ہیں، نہ خدا سے ڈرتے ہیں، تمام بدکاریاں، بداعمالیاں ہمارا شعار ہیں مگر شکوہ اللہ سے ہے کہ بھوکوں مارے ڈالتا ہے، روٹی نہیں دیتا۔ حالاں کہ اُس نے اگر وعدہ کیا تھا تو اُن لوگوں سے جو خدا سے ڈریں۔ ہم ایسے بدکاروں سے کب وعدہ کیا تھا؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ پرہیزگاروں سے بھی بے مشقت و محنت رزق کا وعدہ نہیں تھا۔ چنانچہ جب رسولؐ کو ان صحابہ کا یہ حال معلوم ہوا تو آپ نے دریافت کرایا کہ یہ تم نے کیا کیا کہ سب کام کاج چھوڑ کے بے کار بن بیٹھے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ خدا نے رزق کا وعدہ کرلیا اب ہم کیوں محنت کریں۔ اُس وقت پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم کو یہ نہیں معلوم کہ جو اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاتا ہے اُس کی دُعا خدا قبول ہی نہیں کرتا تو تم پر فرض ہے کہ کسبِ معاش کرو۔

اس حکم رسولؐ کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ تفسیر آیت یہ نہیں ہے کہ ہم بے کار ہو کے بیٹھ جائیں اور خدا چھپّر پھاڑ کے دے۔ بلکہ تفسیر یہ ہے کہ تم خدا سے ڈرو اور تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ رزقِ حلال کی کوشش کرو تو میں ایسی ایسی صورتیں تمھارے رزق کی پیدا کردوں گا جن کا تم کو سان دگمان بھی نہ ہوگا۔ ہمارے رسولؐ ارشاد فرماتے ہیں صنعت و حرفت کی طرف رغبت دلاتے ہوئے کہ "خدا اپنے اُس بندے کو دوست رکھتا ہے جو صنعت و حرفت کرتا ہے۔" خصوصیت سے تجارت

کی طرف مائل کرنے کے واسطے ہمارے رسولؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ "رزق کے دس جزوں میں سے نو جز تجارت سے ملتے ہیں"۔

امیر المومنینؑ نے جب مالکِ اشتر کو اپنی طرف سے مصر کا حاکم بنا کے بھیجا تو ایک دستور العمل بھی عطا فرما دیا جس میں انتظامِ سلطنت، عدل و انصاف، رعایا کے ساتھ برتاؤ۔ بہرحال ہر وہ چیز موجود تھی جو ایک حاکم کے واسطے ضروری ہے، اور جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ کی سیاست کیا تھی اور آپ کس حد تک سیاسیات کے ماہر تھے اور حکومتِ الٰہیہ کا انداز کیا تھا۔ بہرحال اس ہدایت نامے میں جہاں ہر چیز تھی وہاں آپ نے ارشاد فرمایا کہ کسی حاکم کی رعایا میں کون کون لوگ ہوتے ہیں اور اُن کی قسمیں کتنی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک سے حاکم کا برتاؤ کیا ہو۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ "ہر سلطنت میں کچھ وہ لوگ ہیں جو فوج و لشکر میں داخل ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ملک فتح کرتے ہیں، اور کچھ قاضی ہیں جو تمام مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں، اور کچھ وہ لوگ ہیں جو مالیات کی تحصیل وصول اور دوسرے انتظامات کرتے ہیں۔ بہت سے وہ لوگ ہیں جن سے جزیہ وصول ہوتا ہے۔ بہت سے وہ لوگ ہیں جن سے مالگزاری اور ٹیکس وغیرہ ملتے ہیں، اور بہت سی عام رعایا اور محتاج و فقراء ہیں، اور یہ جتنے ہیں سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ جب تک سب مل جُل کے باہمی تعاون اور اتحادِ عمل نہ کریں اس وقت تک کاروبارِ سلطنت چل ہی نہیں سکتا۔ مگر اے مالکِ اشتر! یاد رکھو کہ ان سب کے علاوہ ایک قسم رعایا کی وہ ہے جو تجارت یا صنعت و حرفت کرتی ہے۔ تو مالکِ اشتر! یہ رعایا کا وہ طبقہ ہے جس کے بغیر کسی کا کام نہیں چلتا۔ لشکر والے ہوں یا قاضی یا دیگر حکام ہوں یا ملازمینِ سلطنت

ہوں یا صاحبانِ دولت و زراعت ہوں، کوئی بھی ہو مگر سب تاجروں اور دست کاروں کے محتاج ہیں۔ لہذا سب سے زائد انھیں لوگوں کا خیال کرنا اور ان کی حالت درست کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر ان کی حالت اچھی رہی تو کاروبار حکومت بہترین صورت سے چلتا رہے گا اور اگر یہ بگڑا تو پورا کارخانہ بگڑ جائے گا۔"

یہ وہ تعلیم علیؑ ہے جس پر عمل کر کے آج بھی تمام دنیا دولت مند ہے، حاکم ہے، مہذب ہے، با عزت ہے اور تمام عالم سے ممتاز ہے۔ ہر مہذب و متمدن اور باخبر حکومت زراعت کا انتظام کر رہی ہے تعلیم میں کوشش کر رہی ہے، ملک وسیع کرنے میں کوشاں ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر سب سے زیادہ توجہ یا صنعت و حرفت کی طرف ہے یا تجارت کی طرف۔ اور جس سلطنت کے پاس ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو صنعت و حرفت کرتے ہیں یا تجارت کرتے ہیں وہی سلطنت تمام دنیا سے زائد مالدار ہے اور تمام سلطنتوں پر غالب ہے۔ کیا عالم کی سب سے بڑی لڑائی محض صنعت و حرفت کے بل بوتے پر فتح نہیں ہوئی؟ ہوائی جہاز، راکٹ، بم، تحت البحر کشتیاں اور ایٹم بم کیا صنعت و حرفت سے کوئی الگ چیز تھی؟ یہ سب کچھ محض صنعت و حرفت کا زور تھا۔ اور دولت مندی، جو تجارت کے ذریعے سے حاصل ہوئی تھی اسی کی قوت تھی جس نے اس لڑائی کو ختم کر دیا۔ اسی کی طرف امیر المومنینؑ نے اشارہ فرمایا ہر سلطنت میں سب کچھ ہو مگر ہر چیز تاجروں اور دست کاروں کی محتاج ہے۔

انھیں تعلیماتِ حکومتِ الٰہیہ کا نتیجہ تھا کہ قبلِ ہجرت مکۂ معظمہ میں صرف تیرہ سال مصیبتیں، مشقتیں، زحمتیں اٹھا کے تعلیم دینے کے بعد جب ہمارے رسولِ عربی نے مدینے میں ہجرت کی تو تھوڑے ہی زمانے میں مسلمانوں نے ملک فتح کرنا شروع

کر دیے، علم میں کامل ہوے، چند ہی سال کی مدت میں دُنیا فتح کر ڈالی، دولت سے خزانے چھلکنے لگے، صنعت و حرفت میں قدم رکھا تو تمام دُنیا کی صنعت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ وہ صناعیاں کیں جو آج بنیاد صنعت و حرفت ہیں۔ تجارت کی منزل میں قدم رکھا تو دُنیا کی ہر تجارت اپنے قبضے میں کر لی۔

وہ کون سا انداز صنعت و حرفت ہے جس کی بنیاد عربوں نے نہ ڈالی ہو، اور وہ کون سا انداز تجارت ہے جس کے اصول مسلمانوں نے جاری نہ کیے ہوں؟ اپنے وطن میں تجارت، غیر ملکوں سے تجارت، صحرا کی راہیں گزار کے تجارت، بحری سفر کر کر کے تجارت۔ یہ مان لوں گا کہ دورِ رسالت کے بعد جس طرح مسلمانوں نے مُلک فتح کیے اس میں وہ اعتدال اور تعلیمات الٰہی سے آگے بڑھ گئے۔ صنعت و حرفت کے میدان میں حرام و حلال کی تمیز کیے بغیر قدم بڑھا دیے، تجارت میں حدودِ شریعت سے باہر نکل گئے۔ جس کا سبب صرف یہ کہ حکومتِ الٰہی کے بانی اور مقننّ نے دُنیا کی دل کشی، دولت کی نظر فریبی کو دیکھتے ہوے حکومت دین کے ساتھ حکومت دُنیا اُنھیں ہاتھوں میں دینا چاہی تھی جو خدا و رسولؐ ہی کی طرح ہر چیز کو اعتدال کے اندر رکھیں، ہر بات میں احکامِ شرعی مدِ نظر رکھیں۔ رعایا کو محض اُنھیں راہوں پر چلنے دیں جن سے دین کے ساتھ دُنیا بھی ملے اور دُنیا کے ساتھ دین بھی باقی رہے۔ مال ہو جنّت کی خریداری کے واسطے اور میدان جنگ میں سر فروشی ہو تو مالک الملک کے ہاتھ تاکہ نہ دُنیا ہاتھ سے جائے نہ آخرت۔ مگر دُنیا کے بندوں نے ان دین داروں کے ہاتھ سے حکومت کی باگ نکال کے ایسے ہاتھوں میں دے دی جو بہ ظاہر تو بڑے متقی بنتے تھے مگر تقوے کی راہیں نہ جانتے تھے، بہ ظاہر

تو حاکم بن بیٹھتے تھے مگر حکومتِ الٰہیہ کے انداز سے واقف نہ تھے۔ سیدھی راہ کے سالک بنتے تھے مگر چلتے کیا کہ سیدھی راہ سے واقف نہ تھے۔

آخر بڑھتے بڑھتے حکومت کی نکیل اُن ہاتھوں میں پہنچ گئی جو بہ ظاہر بھی متقی نہ رہے، بہ ظاہر بھی دین دار نہ رہے۔ بہ ظاہر بھی عابد و زاہد نہ رہے جس کا آخری نتیجہ یہ تھا کہ رنگ بدلا، ڈھنگ بدلا، اندازِ حکومتِ الٰہیہ بدلا اور دُنیا ہی دُنیا تمام اسلام میں پیش ہو گئی۔ معلمِ اسلام پر اعتراض نہیں، اسلام کی تبلیغ کرنے والے پر ایراد نہیں ہے۔ اُس نے جو قانون بنائے تھے اُس میں دین و دُنیا دونوں کا نفع پوشیدہ تھا۔ اعتراض اُن پر ہے جو غلط کاری کر گئے۔ اللہ نے لوہا اُتارا یا خلق کیا، کیا اس لیے کہ اس سے وہ خنجر بنایا جائے جو کسی یتیم کو ذبح کرے؟ ہرگز نہیں، یہ کام تو ہماری بدکاری کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح جو قانون و قواعد اس نے معین کیے، جو انداز سکھائے اُن میں دین و دُنیا دونوں کے فائدے ملحوظ رکھے۔ یہ کام تو دُنیا والوں کا تھا کہ اُنھوں نے صرف دُنیا ہی لے لی۔

بالکل کھلی ہوئی ناقابلِ انکار مثال دوں کہ خالق نے اپنے بندوں پر نماز واجب کی اور رسولؐ نے بڑی تاکید و تنبیہ کے ساتھ اس نماز کی تعلیم دی۔ اس نماز میں کوئی دُنیا کا پہلو تو نہیں، کوئی عملِ دُنیا تو نہیں، نفع کے علاوہ ضرر کا آلہ تو نہیں؟ مگر اس کو خدا کیا کرے، رسولؐ کیا کریں کہ میں ایک راجہ کے سامنے ایک دولت مند کے آگے بڑے خضوع و خشوع اور انتہائی زہد و اتقا کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہوں کہ یہ مجھ کو نمازی سمجھ کے دس بیس روپے دے دے۔ اب فرمائیے کہ یہ اللہ نے بُری تعلیم دی یا میں نے بُرا عمل کیا؟

یوں ہی اسلام نے صنعت وحرفت بتائی تو حرام وحلال کی حدیں قائم کرکے، بیع وشراء کی راہیں کھولیں تو احکامِ بیع وشراء بتا کے۔ کون کون سی چیزیں بیچنا اور کیا کیا نہ بیچنا، یہ سب بتایا۔ کس کے ہاتھ بیچنا کس کے ہاتھ نہ بیچنا، اس کی بھی تعلیم دی۔ کیونکر نفع لینا اور کس صورت سے نفع لینا، یہ بھی سکھایا۔ نفع جو ملے اس کو کس صورت سے خرچ کرنا، اور اس نفع میں کس کا کس کا حق ہے، یہ بھی معیّن کردیا۔ کس وقت بازار میں آنا اور کس وقت نہ آنا، یہ بھی بتایا۔ کس وقت بازار کھولنا اور کس وقت بند کرنا، کس وقت کاروبارِ تجارت کرنا اور کس وقت روک دینا، سورۂ جمعہ میں اس کی بھی تعلیم دے دی۔ اور سب سے آخر میں یہ بھی بتادیا کہ اگر بڑے سے بڑا نفع لینا چاہتے ہو اور بہتر سے بہتر چیزیں خریدنا چاہتے ہو تو اپنے خالق ومالک سے معاملت کرو۔ جو مال تم کو کسبِ حلال سے مل گیا ہو وہ بھی ہمارے ہاتھ بیچو اور وہ تمہارا قیمتی نفس جو تم کسی کے ہاتھ نہیں بیچ سکتے وہ بھی بیچو تو ہم خریدلیں۔

کوئی مال ہو، روپیہ ہو، پیسہ ہو، سونا ہو، چاندی ہو، کپڑا ہو، جواہرات ہوں، زمین ہو، غلہ ہو، بہرحال جو بھی تمہارا مالِ حلال ہے وہ ہمارے ہاتھ بیچو اور ہم سے نفع لو، اور وہ نفع لو جو تمہاری ہمت سے باہر۔ ہمارے کارندے ہر مقام پر ہیں، ہم تک مال پہنچانے کی راہیں بے شمار ہیں۔ اعلان واشتہار کی بھی ضرورت نہیں، دن کو، رات کو، سحر کے وقت، ٹھیک دوپہر میں، چھپا چُرا کے، یا ظاہر ظاہر، بحر میں، بر میں، خشکی میں، تری میں، حد یہ ہے کہ اپنی زندگی میں یا اپنے مرنے کے بعد جس طرح چاہو مجھ سے معاملہ کرو۔ فقیر کو دے دو ہم نے خریدا، یتیم کی اعانت کردو

ہم نے پایا۔ کوئی پل بنوا دو صراط کا پروانہ ہم دیں گے۔ مسجد بنوا دو قیامت تک تمہارے واسطے جنت میں گھر ہم بناتے رہیں گے۔ کسی مومن کو کھلا دو جنت کے کھانے ہم سے لو۔ راہِ حج میں صرف کرو جنت تم کو دی۔ زیارات میں خرچ کرو اجر ہم سے لو۔ یہ سب وہ ذریعے ہیں، وہ خدا کے کارندے ہیں جن کے ذریعے سے تمہارا مال خدا نے خریدا اور قیمت میں جنت دی۔

آپ یاد رکھیں کہ جب مال پیدا کرنے کی خدا نے تعلیم دی، معصومین نے بتایا اور سرمایہ کاری کو بُرا نہ قرار دیا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف مائل کر دیا تو اُس میں یہ قید لگا دی کہ بیجا خرچ کرنا کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا "کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو"۔ بلکہ فضول خرچی اور بیجا اخراجات کرنے والے کی بڑی سے بڑی مذمت کی۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔ "اے رسولؐ! فضول خرچی والے شیطان کی برادری والے ہیں اور شیطان ہی نے تو اپنے رب کی سب سے بڑی ناشکری کی"۔ معلوم ہوا کہ جو بیجا صرف کریں وہ شیطان کے بھائی ہیں، اور خدا کے سب سے بڑے ناشکر گزار بندے ہیں۔

یہ تو ان لوگوں کے واسطے ارشاد کیا جو بیجا اخراجات کریں۔ مگر آپ یاد رکھیں کہ جس مال سے جنت خریدی جائے اس میں نہ اسراف ہے نہ تبذیر۔ جتنا بھی چاہئے خرچ کیجئے سب جائز اور بالکل صحیح۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فضول خرچی اور اسراف وہ چیز کہی جاتی ہے جو واپس نہ ملے، یا جس کا فائدہ کوئی نہ ہو لیکن جو چیز واپس مل جائے یا فائدہ دے وہ اسراف نہیں۔ مثلاً آپ نے ایک شخص کو قرض دے دیا اور یہ اطمینان ہے کہ

واپس ضرور ملے گا، تو نہ اسراف نہ صرف بیجا۔ یوں ہی آپ نے اس وقت ہزاروں روپے کی چاندی خرید لی کہ چند دن میں نرخ بڑھ جائے گا تو بہت فائدے سے بک جائے گی۔ اگر ایسے معاملات میں کوئی گھر بیچ کر بھی روپیہ لگا دے تو کوئی اس کو فضول خرچی یا اسراف نہیں کہتا۔ لہٰذا جو مال خدا کی راہ میں صرف کیا جائے اگر وہ واپس نہ ملے اور بڑے سے بڑے نفع کے ساتھ واپس نہ آئے تو فرمایئے کہ فضول خرچی ہے لیکن جب یقین ہے کہ نفع کے ساتھ ملے گا اور اُس وقت ملے گا جب کوئی دینے والا نہیں، کوئی بھیجنے والا نہیں، کوئی رحم کرنے والا نہیں، تو وہ نافہم ہے جو اسے فضول خرچی کہے۔

ہاں وہ صورت یہاں بھی ممنوع ہو گی جو شدید ضرر کا باعث ہو یا ترک، واجب کا سبب ہو مثلاً ایک لنگی تھی اور خدا کی راہ میں دے دی۔ اب نماز نہیں پڑھ سکتے، یا کھانا خدا کی راہ میں دے دیا اور کچھ بھوکوں گیا تو یہ جائز نہیں ہے۔ یا وہ اہل و عیال جو واجب النفقہ ہیں ان کو بھوکا رکھنا، تو یہ جائز نہیں ہے۔ مگر جب علیؑ نے وفائے نذر کی تو یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کیوں کہ جو علیؑ سے ممکن تھا وہ ہر واجب النفقہ کے سامنے رکھ دیا تھا اب یہ اہلبیت کی سخاوت تھی کہ جب علیؑ نے اپنی روٹیاں دیں تو سب نے دے دیں اور اس لیے دے دیں تھیں کہ ان روٹیوں کے عوض وہ ملے گا جو کسی کو نہیں ملا یعنی ان جَو کی روٹیوں کے عوض یہی کیا کم تھا کہ سورۂ دہر مدح کرتا ہوا اترا۔ اور ایک ایک آیت نے نگاہِ بشری اُن انسانوں کی طرف موڑی جو عالم مادیت سے اتنا بلند ہوئے کہ قرآن کی زبان تعریف و ستائش کیے بغیر رک نہ سکی۔

دیکھنے میں تو چند آیتوں نے مدح و ثنا کی مگر حقیقت یہ ہے کہ سورۂ دہر تعریف کا دفتر بن گیا اجزائے عمل کی فہرست ہو گیا۔ بلکہ صرف سورہ نہیں یوں کہوں کہ قرآن نے تعریف کی

اور قرآن دراصل کلامِ الٰہی ہے لہذا واقعہ یہ ہے کہ خدا نے تعریف کی اور خدا ہی تو وہ ہے جو ان حضرات کا خلق کرنے والا تھا، لہذا یوں کہوں کہ بنانے والے اور پیدا کرنے والے نے تعریف کی، اور یہ تو خدا ہی کے مصنوع تھے، مخلوق تھے، تو یوں عرض کروں کہ بنانے والے نے کچھ ایسا بنایا کہ خود اپنی تعریف کرنے لگا۔ واہ، کیا کہنا میرا، کیا بے مثل بنایا، کتنا بے نظیر بنایا! تو حدیثِ رسول سچ ہو گئی کہ جس نے اُن کا ذکر کیا اس نے خدا کا ذکر کیا؟۔

اور پھر بنانے والے نے فقط تعریف ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ مدح و ثنا کے بعد جو کی چند روٹیوں کی جزا جو دینا شروع کی تو دستِ کرم رُکتا ہی نہیں فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ سے جو فہرستِ جزا شروع کی تو جب تک كَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا نہ آگیا اس وقت تک بارشِ رحمت رکی ہی نہیں۔ پہلے ابرِ کرم نے آکے گھیرا کہ ہولِ محشر کا ذکر کیا میں تو حفاظت کو موجود ہوں، پھر رحمت کی ہواؤں نے فرحت و سرور دیا کہ خوش رہو غم کی منزل نہیں، پھر عطا کے چھینٹوں نے چہروں کو تازگی دی کہ پھول سے چہرے کملائیں کیوں؟ پھر جزاؤں کی موسلا دھار بارش سے موتی کے ورق جنت بنا دیے کہ فردوسِ بریں تمہارا ہی ہے تم کو اُلجھن کیوں؟ پھر بوسیدہ لباسوں پر نظر پڑی تو یدِ قدرت کے بنے ہوئے، صناعِ ازل کے سیئے ہوئے نرم و نازک ریشم کے خلعت اُتار دیے کہ جانور کی اُترن تمہارے دشمن نہیں، تم میری جنت کا ریشم پہنو جس میں حرمت کا شک و شبہ بھی نہیں۔ پھر فرشِ خانہ پر نگاہ پڑی تو ارشادِ رب العزت ہوا کہ جلد گوسفند سائل کو دے دو، تم ہماری جنت کی مسندیں لو، تمہارا تکیہ خدا ہی پر رہا تو امامت کے تکیے لگا کے بیٹھو کہ شانِ حکومت الگ نہ ہو۔ نورِ شمس و قمر

تمھاری ہی بدولت ہے تو تم کو ان کی ضرورت کیا، جنت میں چلو جہاں سردی ہے نہ دھوپ۔ تمام عالم کے واسطے تم سایۂ رحمت بن گئے تو جنت کی گھنیری چھاؤں مبارک ہو۔ تم کیوں تلاشِ رزق کرو، میووں سے لدی ہوئی ڈالیاں خود جھوم پڑیں۔

ہاں، شانِ عدل و انصاف یہی تھی کہ ایک دن گھر کا کام فضہ کرے اور ایک دن کاروبارِ خانہ تم کرو تو اب اِرم میں آرام سے بیٹھے رہو، موتی کی طرح باآبرو بچے خدمت کے واسطے حاضر ہیں۔ مٹی کے برتن ہٹا ڈالو، لو تمھارے واسطے شیشے اور چاندی کے جام وسبو ہیں، ساغر ومینا ہے۔ تم نے روزے کی حالت میں پیاس کی تکلیفیں اُٹھائیں، تو لو یہ سلسبیل کے جام پیو جو انتہائی خوش مزہ ہوں گے۔ اب میں کہاں تک تفصیل کروں، ہر نعمت جنت کی تمھارے واسطے اور آخرت کا ملک کبیر کُل کا کُل تمھارا۔ تمھارے جسم نورانی کہاں اور یہ پیوند لگے ہوے بالوں کی چادریں اور کُرتے کیسے؟ نہیں اب تو تم دھانی کریب اور اشارۂ قدرت کی بنائی ہوئی اطلس کے کپڑے پہنو۔ میری نگاہ مرحمت نے خوب دیکھا کہ تم تو تم تمھارے غلام بھی دُنیا کی نجس شراب کے قریب نہ گئے تو آؤ میں خود تم کو اپنے یدِ قدرت سے شرابِ طہور پلاؤں۔ میرے دوستو! میرے محبوب بندو! تم ہمیشہ میری بارگاہ میں سرِ نیاز جھکائے ہی رہے اور میں جانتا ہوں کہ میرے احسانات کے ممنون ہی رہوگے۔ مگر سر اُٹھاؤ، شرمندہ نہ ہو، یہ میری عطا نہیں ہے یہ تو تمھارے عمل کی جزا ہے۔ تم نے کام وہ کیا کہ میری مشیت نے تم کو سب کچھ دے دیا۔ تم اس کو میری مرحمت سمجھو، مگر میرے عدل کی آواز ہے کہ یہ سب کچھ دینے کے بعد میں تمھارا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ تم وہ کام کر گئے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا۔

یہ فہرست، عطا کردہ آیتیں تھیں جن کی تفصیل میں نے زبانِ حال سے کی، اور اپنے باعیب مقال کے ذریعے سے آپ کی خدمت میں پیش کر گیا، مگر آپ نے خیال بھی فرمایا کہ جزائے عمل کے تذکرے میں جب قرآن نے ابتدا کی تو بارہ آیتیں ختم ہوئے بغیر لسانِ قدرت کو قرار نہ آیا۔ شاید اشارہ کرنا تھا کہ اس عطائے الٰہی میں تین امام نہیں بلکہ بارہ اماموں کی گنجائش ہے اور سب کے سب اسی عطا کے مستحق ہیں

یہ ہے وہ مال کی تجارت جو آلِ رسولؐ نے کی۔ ان جَو کی روٹیوں کی بازارِ دُنیا میں کیا قیمت ملتی، کون ان کو، باغ کیسا ایک درخت دے کے بھی خریدتا۔ غذائے جسم تو بے شک بنتیں مگر غذائے روح یہ روٹیاں نہ بنتیں۔ مگر جب روزے پر روزہ رکھ کے تھوڑی تکلیف اُٹھا کے خدا کے ہاتھ بیچ ڈالیں تو سورۂ دہر بیع نامہ بن کے اُترا، لوحِ محفوظ میں دفتر تھا جس میں ہمیشہ کے واسطے اس بیع نامے کی حفاظت ہو گئی۔ امینِ وحی، اور رسولِ عربیؐ گواہ حاشیہ تھے۔ جن کے ذریعہ سے یہ دستاویز آئی۔ قرآن کے صفحے وہ کاغذ تھے جن پہ یہ بیع نامہ لکھا گیا، اور قلمِ قدرت محرّر تھا جس نے دستاویز کی عبارت لکھی اور ہر ہر آیت مہرِ عظمت تھی جس نے اس دستاویز کی تصدیق کی اور تفصیل عطا کی۔

ابتدائی آیتوں میں ہر صیغہ ماضی کا آیا جس کے معنی یہ تھے کہ خوفِ محشر سے بچا دیا۔ فرحت و سرور دے دیا، جزائے عمل میں جنت و حریر دے دیا تاکہ ہر چیز پر اہلبیتؑ کا قبضہ اسی وقت سے ہو جائے کہ شرطِ بیع مکمل رہے۔

یہ تمام چیزیں بتا رہی ہیں کہ اہلبیت دُنیا ہی میں تھے، گھر ہی میں بیٹھے بیٹھے ان کو سب کچھ مل گیا۔ اب جو بھی جنت کے منتظم ہیں خادم ہیں، نگراں ہیں، وہ تھیں کے

نوکر، انھیں کے خادم، انھیں کی طرف سے منتظم ہیں۔

سُنا آپ نے، سمجھ دار خادموں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ جب مالک زبان سے حکم دے اُسی وقت خدمت کریں بلکہ باقہم نوکر چشم و ابرو کا اشارہ دیکھتے ہیں، وقت و ضرورت کو خوب پہچانتے ہیں۔ کھانے کا وقت آیا تو مالک کے حکم کی ضرورت نہیں، دسترخوان پہلے ہی سے تیار۔ سواری کا وقت آیا تو حکم کی حاجت نہیں درِ دولت پر سواری موجود۔ آرام کا وقت آیا تو فرمائش کرنے سے پہلے بستر تیار۔ یہی حال خادمانِ بارگاہِ اہلبیتؑ کا تھا۔ جب دیکھا کہ پھلوں کی ضرورت ہے جنّت کا میوہ لے کے حاضر، کھانے کی ضرورت دیکھی تو دسترخوان بچھا دیا، پانی کی ضرورت دیکھی کوثر سے بھر کے لے آئے، میدانِ جنگ میں تلوار ٹوٹی ذوالفقار لے کے دوڑ پڑے، عید کی رات آئی لباس لے کے حاضر ہوئے۔ اور پھر کہیں اور سے نہیں، اُسی جنّت سے جو ملکیّت آلِ رسولؐ تھی۔

مگر اس مقام پر ایک بات اور عرض کر دوں کہ ایک ہوتا ہے بیچنے والا اور ایک ہوتا ہے خریدنے والا۔ تو اب آپ ہی بتائیں کہ بیع نامہ کون لکھتا ہے، بیچنے والا یا خریدنے والا؟ ہر شخص کہے گا کہ بیع نامہ لکھنا خریدنے والے کا فرض نہیں بیچنے والے کا فرض ہے۔ اب فرمائیے کہ جب آلِ رسولؐ جَو کی روٹیاں سوال کرنے والوں کے ہاتھوں خدا کے ہاتھ بیچ ڈالیں تو خریدار تھا اللہ اور بائع تھے آلِ محمدؐ، مگر قرآن ہے کلامِ الٰہی اور بیع نامہ قرآن بن کے اُترا تو مانیے کہ یہ دستاویز لوحِ محفوظ میں خدا نے لکھی اور امینِ وحی کے ذریعے آلِ محمدؐ کے پاس بھیجی۔ تو تسلیم کیجیے کہ بیچنے والے یہ نہ تھے خدا تھا۔

یا یوں فرمائیے کہ جب کسی مال کی خرید و فروخت روپے اور اشرفی سے ہو تو یہ کہہ دینا بالکل آسان ہے کہ مال دینے والے نے بیچا اور روپیہ دینے والے نے خریدا، اور جب مال کے مقابل میں مال ہو یعنی روٹیوں کے مقابل میں جنت، تو اب فرق صرف اعتباری ہے ورنہ حقیقت ہے کہ دونوں ہی بیچنے والے اور دونوں خریدنے والے کہے جا سکتے ہیں لیکن فرق اگر ہوگا تو صیغہ پڑھنے سے یا بیع نامہ لکھنے سے۔ تو جب اللہ نے بیع نامہ لکھ دیا تو واضح ہو گیا کہ بائع وہ تھا خریدار یہ تھے۔ اور یہ کلیہ ہوتا ہے کہ بیچنے والا اپنی کوئی چیز اسی لیے بیچتا ہے کہ فائدہ اُٹھاؤں اس لیے نہیں بیچتا کہ ضرر اٹھاؤں۔ تو جب خدا نے جنت ان جو کی روٹیوں کے عوض بیچی تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدہؑ کے ہاتھ کی چند روٹیاں اتنی گراں بہا تھیں جو پوری جنت کے مقابل میں نفع دے گئیں خریدار کا اس میں ضرر نہ تھا، مگر اس مقام پر اتنا اور سمجھ لیجیے کہ خود اللہ کو کسی فائدے کی حاجت نہیں، لہٰذا جنت کی بیع روٹیوں کے عوض میں پُر منفعت بیع تھی مگر نفع اس بیع میں آلِ رسولؐ ہی کا تھا۔

یہ تھی حقیر مال کی وہ بے نظیر تجارت جو آلِ رسولؐ نے کر کے دکھائی کہ دُنیا والوں سے معاملت کرنا ضرر ہے اور خدا کے ہاتھ خرید و فروخت کرنا نفع ہی نفع ہے۔ اور پھر یہی نہیں کہ جَو کی روٹیاں بیچ ڈالیں بلکہ جب ضرورت ہوئی تو چادر بیچ دی، زیور بیچ دیا، پیراہن بیچ ڈالا، موتیوں کا گلوبند بیچ ڈالا، باغ بیچ ڈالا۔ جو کچھ پایا وہ بظاہر سائل کو دیا، فقیر کو دیا، محتاج کو دیا، مگر درحقیقت خدا کے ہاتھ بیچا اور قیمت میں لباسِ جنت، زیورِ جنت، قصرِ جنت، باغِ ارم، آٹھوں بہشت، کوثر و سلسبیل، جنت کے میوے، وہیں کے خادم خریدتے ہی چلے گئے، اور آخر

اتنا خریدا کہ گھر بھر گیا، دل بھر گیا، نیت بھر گئی اور جزائے عمل میں جو کچھ خدا کی مشیت تھی وہ سب لے لیا۔ اب جو لے وہ ان سے لے۔ جنت لو تو انھیں سے لو، کوثر لو تو انھیں سے لو، حوران جنت لو تو انھیں سے لو، جنت کے خادم لو تو انھیں سے لو، طوبیٰ کا سایہ لینا ہو تو انھیں کے گھر سے لو۔ یاد رکھیں آپ کہ دنیا کی ہر چیز تو دنیا والوں سے بھی مل جائے گی مگر آخرت کی کوئی چیز ہرگز نہیں مل سکتی جب تک یہ نہ دیں۔ چاہے رسولؐ عطا کریں یا سیدہؑ کی مرحمت ہو، یا علیؑ کی عطا ہو، یا حسنؑ کا احسان ہو، یا حسینؑ کا ابرِ کرم ہو۔ بہرحال یہ یا ان کی معصوم اولاد، جو ملے گا انھیں سے ملے گا۔ ہاں محتاج تو ہر ذات کے ہیں مگر آج کل زمانہ یہی چاہتا ہے کہ ہم کو جو کچھ لینا ہے وہ اپنے تیسرے امام سے لیں۔

اور حقیقت بھی یہ ہے جیسی قربانی حسینؑ نے پیش کی اور جو چیزیں حسینؑ نے اللہ کے ہاتھ فروخت کیں ان کی مثال نہ ابتداء آفرینش سے ۶۱ھ تک ملتی ہے اور نہ قیامت تک ملنا ممکن ہے۔ جناب ابراہیمؑ نے راہِ خدا میں ایک فرزند پیش کیا اور اس انداز سے کہ روایات بتلاتی ہیں ملائکہ سماوات نے اپنی عبادتیں ترک کر دیں، کائنات میں سناٹا چھا گیا۔ باپ کے ہاتھ میں چھری ہو اور چہیتے بیٹے کا گلا، پھر بھی ہاتھ نہ کانپے، دل نہ لرزے کوئی معمولی امتحان نہ تھا۔ مگر عزادارانِ حسینؑ انصاف آپ کے ہاتھ ہے باپ بیٹے کے ذبح پر تیار تو ہوا۔ پھر بھی اسمٰعیلؑ فرزند نے جو خود بھی نبی تھا پدرِ بزرگوار کی قوتِ ضبط کو دیکھ کر وصیت کر ہی دی بابا آنکھوں پر پٹی باندھ لیجیے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے

جگر دیجیئے تاکہ مجھے اپنے خون میں کروٹیں بدلتے اور زمین پر تڑپتے نہ دیکھ سکیں۔ لیکن یہ حسینؑ کا دل ہے کہ علی اکبرؑ کا سا حسین و جمیل تصویرِ جمالِ رسالت فرزند ایڑیاں رگڑ رہا ہے، حسینؑ سر زانو پر رکھے فرما رہے ہیں "یَا بُنَیَّ عَلَی الدُّنْیَا بَعْدَکَ الْعَفٰی" "اے بیٹا تیرے بعد زندگانی دنیا پر خاک ہے"۔ "لَقَدْ اسْتَرَحْتَ مِنْ کَرْبِ الدُّنْیَا وَھَمِّھَا وَتَرَکْتَ اَبَاکَ وَحِیْدًا فَرِیْدًا" "بیٹا تم کو تو زندگانی دنیا کے رنج و غم سے راحت مل گئی لیکن اپنے باپ کو نرغۂ اعداء میں یکہ و تنہا چھوڑ گئے"۔ اور کبھی باپ کے ہاتھوں پر چھ مہینہ کی جان علی اصغرؑ تیرِ حرملہ کھا کر منقلب ہو جاتا ہے۔ مگر کیا کہنا امام حسینؑ کے مضبوط ارادے اور مستحکم عزم کا کہ دشمنوں کے دل تھرا جاتے ہیں، زمین و آسمان لرز اٹھتے ہیں۔ حسینؑ کے ہاتھ نہیں کانپتے، اپنے ہاتھ سے معصوم بچے کی تربت بناتے ہیں۔ آغوشِ مادر میں پلنے والے بچے کو آغوشِ لحد کے سپرد کر دیتے ہیں، گہوارے کی زینت کو زینتِ قبر بنا دیتے ہیں لیکن قربانی کا عزم متزلزل نہیں ہوتا۔

ایوبؑ کا صبر مشہورِ زمانہ ہے اور ضرب المثل ہے، تمام مال کے ضایع ہونے پر صبر کیا، تمام اولادوں کے داغ کو برداشت کیا، دوستوں کے چھوڑ دینے پر صبر کیا، بیماریوں کی تکالیف صبر و ضبط سے برداشت کیں، لیکن جب نوبت ناموس تک پہنچی اور زوجہ کے گیسو پر نامحرم کی نظر پڑ گئی، تو دستِ دعا بلند ہو گئے۔ زبان پر فریاد آ ہی گئی اور قرآن نے دہنِ جنابِ ایوبؑ سے نکلے ہوئے نالہ کو رَبِّ اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ

اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ کی لفظوں میں نقل کر دیا۔ ہاں ایوبؑ کی قوتِ برداشت کی حد معلوم ہو گئی۔ مگر کبھی امام حسینؑ نے بھی کہا پالنے والے بس بس اب مصیبتوں پر صبر نہیں ہو سکتا۔ اے میرے مالک بس اب امتحان ختم کر دے۔
ایوبؑ کربلا کا تو عالم دشمنوں کی زبان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے جتنے مصائب بڑھتے جاتے تھے رنگِ رُخ اور روشن ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک شخص اُس وقت کی تصویر کشی کرتا ہے کہ جب امام حسینؑ زخموں سے چور چور تمام دوستوں اور عزیزوں کے زخم دل پر کھا کر زمین پر بیٹھے، ضعف و نقاہت سے جھوم رہے تھے۔ لکھتا ہے کہ خدا کی قسم میری نظر سے کوئی ایسا حسین نہیں گزرا جیسے حسین و خوبصورت اس وقت حُسینؑ نظر آرہے تھے اب آپ ہی انصاف کریں جس کا حُسن دشمن کی نگاہ میں یوں کھپ رہا تھا جب اس کو چاہنے والی ماں نے اس عالم میں دیکھا ہو گا تو اس کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ جب ان نانا نے جو دوش پر سوار کرتے تھے ذرا سی تکلیف سے تڑپ جاتے تھے دیکھا ہو گا تو کیا عالم ہوا ہو گا۔ ہاں یہ افراد تو عالمِ انوار و ارواح سے مشاہدہ فرما رہے تھے۔ مگر جب وہ چاہنے والی بہن خیمے سے نکلی جس نے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھائی پر نثار کر دیا تھا اور ایک بلندی پر تشریف لا کر اس منظر کو دیکھا کہ بھائی غش میں ہیں، قاتل شمشیر بکف بڑھ رہا ہے، تڑپ گئیں۔ کبھی داہنی طرف دیکھا کبھی بائیں طرف رُخ کیا، کوئی مددگار نہ تھا، کس کو پکاریں، کس سے فریاد کریں۔ ہائے زینبؑ کی مجبوری

رُخ کیا پسرِ سعد کی طرف فرماتی ہیں یَابْنَ سَعْدٍ اَیُقْتَلُ اَبُوْ عَبْدِاللّٰہِ الْحُسَیْنِ وَاَنْتَ تَنْظُرُ اِلَیْہِ" اے پسرِ سعد کیا میرا ماںجایہ قتل کر دیا جائے گا اور تو دیکھتا رہے گا۔ عمر سعد نے کچھ جواب نہ دیا۔ اب رُخ کیا مدینہ کا یَا جَدَّاہُ! صَلّٰی عَلَیْکَ مَلَائِکَۃُ السَّمَاءِ اے نانا! آپ پر ملائکہ آسمان کا سلام ذرا آکر دیکھیے کہ آپ کا نازپروردہ حسینؑ خاک و خون میں غلطاں ہے اور کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

مجلس ہفتم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِدِیْنِہِ الْمُبِیْنِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَخَاتَمِ الْمُرْسَلِیْنَ نَبِیِّنَا وَشَفِیْعِ الْمُذْنِبِیْنَ اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاَھْلِ بَیْتِہِ الْھُدَاۃِ الْمَھْدِیِّیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ، اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ط وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰاتِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ط وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

خدائی اعلان ہے قرآن عظیم کے آیات میں اور رسولِ عربی کی زبانِ حقیقت ترجمان سے کہ "خدا نے خریدا صاحبانِ ایمان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر کہ ان کو جنت دی جائے گی۔ تو یہ مومن خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ اس جہاد میں قتل بھی کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں۔ یہ تو خدا کا بالکل سچا اور کھرا وعدہ ہے جو توریت و انجیل و قرآن ہر کتاب میں موجود ہے اور خدا سے بڑھ کر وعدہ وفائی

کرنے والا کون ہے۔ تو اے ایمان والو جو معاملہ خرید و فروخت کا تم نے خدا سے کیا ہے وہ تم کو مبارک ہو، یہی تو بڑا نفع اور کامیابی ہے"۔

یہ ہے قرآن مجید کی وہ آیت جس نے ثابت کیا کہ اسلام محض اصول کا نام نہیں ہے، اسلام کی تعلیم محض خدا و رسول، امام اور معاد کو بتا کے ختم نہیں ہو گئی، وہ محض خیالی اور نظری و علمی مذہب نہیں ہے بلکہ جہاں اسلام میں اصول دین ہیں ہاں فروع بھی موجود ہیں۔ اور فروع میں محض نماز و روزہ، حج اور دیگر عبادات ہی نہیں ہیں بلکہ زکوٰۃ کے ذریعے امداد باہمی کی راہیں کھول دی گئی ہیں، خمس بتا کے خراج سلطانی لازم کیا گیا ہے، زراعت کے احکام پیش کر کے کاشتکار بننے کی ترغیب دی گئی ہے اور صنعت و حرفت میں حرام و حلال بتا کے، سنت و مکروہ کا تعین کر کے صناع بننے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حکومت کے تمام انداز معین کر کے سلطنت کرنا جائز قرار دیا گیا ہے۔ جہاد کی مکمل تعلیم دے کے ملک فتح کرنے پر حدِ شریعت کے اندر اُبھارا گیا ہے۔ تجارت کے تمام رطب و یابس، خشک و تر بتا کے تاجر بننے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ خود اپنے رسولؐ کو پہلے پہل تجارت ہی میں لگایا۔ پھر علیؑ نے مزدوری اور تجارت دونوں کر کے اسلام کا عملی ہونا ثابت کیا۔ پھر تمام ائمہ نے کبھی تجارت کبھی زراعت کر کے ان چیزوں کو شریعت میں ممدوح ہونے کی تعلیم دی۔ کبھی ملائکہ کو بائع اور مشتری کی شکل میں بھیج کے تجارت کی بلندی ظاہر کی۔ حد یہ ہے کہ کبھی بازار وحدت میں خود خریدار بن کے آیا تاکہ تجارت کی بلندی روشن ہو جائے۔

کسی سلطنت اور حکومت کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ اپنی رعایا کو زبردستی عالم

بنادے، صناع بنادے، تاجر بنادے، کاشت کار بنادے، دولت مند بنادے۔

ہاں جو سلطنتیں رعایا کی خیر خواہ ہیں ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کے واسطے مختلف قسم کے مدرسے کھول دیں جہاں وہ تعلیم حاصل کریں، وہ سامان مہیّا کردے جن کے ذریعے سے وہ صناع بن سکیں، وہ راہیں آسان کردے جن پر چل کے وہ تجارت کرسکیں، وہ ترکیبیں بتادے جو ان کی دولت مندی کے ذریعے ہوں۔ اور تمام رعایا کو ان چیزوں کی طرف ترغیب دلائے، مائل کرے، توجّہ دلائے کہ وہ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، علم و دولت حاصل کریں۔

کیا اور ہر رعایا کی خیر اندیش سلطنت نے یہی کیا، اور دین اسلام نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ البتہ یہ فرق ضرور ہوگیا کہ جو جس سلطنت کا مالک تھا اُس نے اپنا بھی فائدہ دیکھا اور رعایا کی بھی منفعت، جو سُلطان تھا اُس نے اپنے واسطے بھی بہت کچھ کیا اور رعایا کے واسطے بھی کیا، مگر سلطنت الٰہیہ کے مالک نے اپنے واسطے کچھ نہ کیا، اپنی منفعت کسی چیز میں نہ قرار دی، بلکہ مالک و سلطان کیسا، جو اس کے سچّے نائب تھے اُنھوں نے بھی اپنے واسطے کچھ نہ کیا جو کیا وہ رعایا کے واسطے!! اگر رعایا کے واسطے تعلیم گاہوں کی ضرورت ہے تو اُس نے لاکھوں مُعلّم اپنی بارگاہ سے تعلیم دے کے بھیجے کہ جس علم کی میرے بندوں کو ضرورت ہو سکھا دو۔ کسی کو زرہ بنانا سکھائی، کسی کو لباس درست کرنے کی تعلیم دی، کسی کو کشتی بنانا بتائی، کسی نے زنبیل بنا کر بسر کی، کسی نے لوہے اور تانبے کو گلا کے اُس سے مختلف چیزیں بنانا سکھائیں، کسی نے جہاد کرنا بتایا، ملک فتح کرنا سکھائے، جانوروں کو مطیع کرکے اُن سے کام لینا سکھایا، تخت سلطنت پر بیٹھ کر حکومت کے

انداز بتائے، ہوا کو قبضے میں لا کے ہوا پر اُڑنا بتایا۔

اگر بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعایا کو تحصیل علم، تکمیل صنعت و حرفت، دولت و سلطنت، ملک و مال، تجارت و زراعت کی طرف مائل کرے تو حکومت الٰہیہ نے اس میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ آپ یاد رکھیں کہ تجارت سے فائدہ اٹھانا، زراعت سے صحیح اور پوری منفعت حاصل کرنا، صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنا، خدا کی پیدا کی ہوئی بے شمار چیزوں سے کام لینا، مختلف طریقے سے ایجادیں کرنا، یہ جو کچھ بھی ہے سب قدرت و قوت کا کرشمہ ہے۔ ہم کو قدرت ہے کہ ہم بجلی بنالیں، ہمارے اختیار میں ہے کہ ریل چلالیں۔ ہم کو اس بات پر قبضہ حاصل ہے کہ ہم ہوا پر اڑیں، ہمارے امکان میں ہے کہ ہم ہزاروں کوس کی آواز سُن لیں، ہم یہ کرسکتے ہیں کہ ایک گولے سے لاکھوں آدمی ہلاک کردیں۔ یہ سب کچھ ہمارے اختیار و قدرت کے کرشمے ہیں۔ مگر یہ قدرت، یہ قوت، یہ اختیار ہم میں کب آتا ہے، کس وقت آتا ہے؟ کیا بطن مادر سے لے کے یہ قدرت پیدا ہوئے تھے؟ کیا کسی وسیلے اور ذریعے کے بغیر ہم کو یہ سب کچھ مل گیا تھا؟ جی نہیں۔ ہم جب بطن مادر سے باہر آئے تو ہم کو کچھ بھی نہ آتا تھا۔ یہ تمام اقتدار ہم کو بلا وسیلے حاصل نہیں ہوا بلکہ اس قوت و اقتدار کا ذریعہ علم تھا اور علم ہے۔

تمام دُنیا کے حکماء نے تسلیم کرلیا ہے کہ علم کی زیادتی سے قدرت بڑھتی ہے اور علم کی کمی سے قدرت گھٹتی ہے۔ جب تک ہم کو علم نہ تھا کہ کس دوا کا کیا اثر ہے اس وقت تک ہم کوئی علاج نہ کرسکے۔ البتہ جب ہم کو معلوم ہوا کہ فلاں دوا میں یہ اثر ہے تو ہم کو علاج کرنا آیا۔ جب تک ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ لوہا کیونکر گلایا جاتا ہے، پیتل اور تانبا کیونکر پگھل سکتا ہے اس وقت تک ہم کوئی پُرزہ نہ ڈھال سکے، کوئی اوزار

نہ بنا سکے۔ جب تک ہم کو یہ نہ معلوم تھا کہ پانی سے ہوا کیونکر بنتی ہے اور اس ہوا کو جس کو ہم بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں قابو میں لا کر کیونکر بڑی سی بڑی مشین چلائی جا سکتی ہے اس وقت تک ہم ریل چلا سکے نہ جہاز، نہ کوئی مشین بن سکی نہ کل جس وقت تک ہم کو یہ نہ معلوم تھا کہ مقناطیسی قوت کیا ہے، تمام فضائے عالم میں کون کون سی لہریں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ کس طرح قابو میں آسکتی ہیں اُس وقت تک نہ ہم بجلی کی روشنی پیدا کر سکے نہ ریڈیو۔ البتہ جب تجربے سے، کسی کی تعلیم سے ہم کو ان تمام چیزوں کا علم ہوا اور ہم نے اس علم سے کام لیا تو دُنیا کی ہر چیز قبضے میں آئی اور اسی قبضہ و اقتدار سے کام لے کر ہم نے وہ سب کچھ کر دکھایا جو اس وقت دُنیا کو حیران کیے ہوئے ہے۔

تو معلوم ہوا کہ ان سب چیزوں کی اصل علم ہے۔ اسی لیے علم حاصل کرنے کے واسطے حکومت الٰہیہ نے سب سے زائد انتظام کیا اور جو پہلا نائب بھیجا اُس کے واسطے ارشاد ہوا عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا "ہم نے آدم کو ہر نام کی یعنی ہر چیز کی تعلیم دے دی" کیوں کہ نام ہی ہر چیز کے پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ جب آدم کو ہر نام بتایا تو آدم ہر چیز کو پہچان گئے۔ اور اسی پہچان جانے میں آدم اور ملائکہ کا مقابلہ تھا۔ میں نہیں عرض کر سکتا کہ یہ بات صرف میرے ہی ذہن میں آئی اور کسی شخص کو اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ استغفراللہ! میں کیا اور میرا علم کیا۔ مگر اتنا عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ میں نے کسی سے سُنا نہیں اور جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس مطلب تک میری تنگ نگاہ کسی کتاب میں پہنچی نہیں۔ اور وہ یہ کہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے آدم کو نام سکھائے اور جب مقابلہ ہوتا ہے تو نہ امتحان لینے والا

آدمؑ سے کہتا ہے کہ تم سب نام پڑھ کے سُناؤ کہ جو نام ہیں نے بتائے تھے وہ یاد ہیں یا نہیں؟ اور نہ ملائکہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ تم سب سنا دو۔ جی نہیں، بتائے تو تھے نام اور امتحان کے واسطے آدمؑ اور ملک دونوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں، کچھ چیزیں اور وہ بھی وہ، جو ذی روح ہیں، جاندار ہیں۔ اور سوال ہوتا ہے کہ ان کے نام بتاؤ یعنی اسم کے معنی ہیں نام، اور "مسمّٰی" وہ ذات جس کا نام ہے۔ جیسے میں اور ہوں میرا نام اور ہے۔ یاقوت نام ہے ایک پتھر کا، تو وہ پتھر اور ہے اور اس کا نام اور ہے۔ انار نام ہے ایک پھل کا، تو وہ پھل اور ہے اس کا نام اور ہے۔ نام اور وہ ذات جس کا یہ نام ہے دونوں ایک چیز نہیں ہوتے۔ نام الگ ہوتا ہے اور وہ شئے الگ ہوتی ہے۔ البتہ اگر ہم وہ نام بھی جانتے ہیں اور وہ شئے بھی جانتے ہیں جس کا یہ نام ہے، دونوں چیزیں ہم جانتے ہیں تو جب وہ نام ہمارے سامنے آئے گا تو ہم پہچان جائیں گے کہ وہ چیز کیا ہے اور اگر صرف نام ہی رٹ لئے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ کس چیز کا نام ہے تو نام سُن لینے سے ہم اُس چیز کو نہیں پہچان سکتے جس کا یہ نام ہے۔

جیسے ایک بزرگ کے واسطے مشہور ہے کہ وہ ہندوستان میں آئے تو جو چیز سامنے آئی اس کا نام لکھتے گئے مگر ہزاروں چیزوں میں حافظہ کہاں تک کام دے کہ یہ کس چیز کا نام ہے اور یہ کس شئے کا نام۔ لہذا نام تو کتاب میں لکھے رہ گئے اور وہ چیزیں جن کے نام لکھے کتاب حافظہ سے گم ہوگئیں۔ جب وطن گئے تو اتفاق سے ان کے وطن میں ہاتھی آگیا جو وہاں کبھی نہ آیا تھا۔ لوگ حیران کہ یہ پہاڑ کا پہاڑ عجیب الخلقت جانور کون ہے۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے کہ "جناب تو ہر شہر کی سیاحت کر چکے ہیں آپ بتائیں یہ کیا بلا ہے؟" ان بزرگ نے جلدی جلدی

اپنی کتاب نکالی، بڑی تلاش کے بعد نام کا پتہ چلا مگر اتفاق سے ہاتھی اور امردد ایک ہی مقام پر دونوں لفظیں لکھی ہوئی تھیں لیکن حافظہ اپنا کام بھول چکا تھا لہذا سمجھ میں نہ آیا کہ نام کیا ہے؟ آخر گھبرا کے فرما دیا کہ "بھئی ٹھیک ٹھیک تو نہیں کہہ سکتا مگر یہ ہاتھی ہے اور نہیں تو پھر امردد تو ہے ہی"۔ تو معلوم ہوا صرف نام یاد ہونے سے اس ذات کی پہچان نہیں ہوتی جس کا نام ہے۔

اب اللہ نے بھی آدمؑ اور ملائکہ دونوں کا امتحان اسی بات میں لیا کہ نام تو تم کو سب یاد ہیں مگر پہچانتے بھی ہو کہ وہ ذاتیں کیا ہیں جن کے نام یہ تھے۔ اس لیے تعلیم تو دی ناموں کی اور مقام امتحان میں پیش کر دیے کچھ جاندار اور ذی روح کہ بھلا پہچانو تو یہ کون ہیں؟ آدمؑ فوراً پہچان گئے کہ یہ، یہ ہیں اور یہ ان کا نام ہے مگر ملائکہ نہ بتا سکے صرف نام ہی بتا کر رہ گئے۔

اب اگر آپ سوال کریں کہ یہ تم نے کہاں سے نکالا کہ یہ جاننے پہچاننے کا امتحان تھا تو میں عرض کروں گا کہ ان روایتوں سے نکالا جن میں تصریح ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ کو پیش کیا گیا تھا کہ ان کے نام بتاؤ مگر ملک۔ ہر ذات کا نام الگ الگ نہ بتا سکے اور آدمؑ نے بتا دیا۔ اور اس کے علاوہ قرآن سے نکالا کیونکہ جہاں نام بتانے کا ذکر ہے وہاں ارشاد ہے عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا اور جہاں ذاتوں اور مسمیٰ کے پیش کرنے کا بیان ہے وہاں ارشاد ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ اور تمام صاحبانِ علم جانتے ہیں زبان عربی میں "ھا" اور "ھم" میں بڑا فرق ہے "ھا" سے بے جان چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جیسے گھاس پھونس پھول پھل، زمین، پتھر آسمان، ستارے وغیرہ اور "ھم" کی ضمیر سے صرف

اُنھیں چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو جاندار ہوں - لہٰذا آیت نے جب ناہوں کی طرف اشارہ کیا تو "ھا" کہا اور جن چیزوں سے امتحان لیا تھا جب اُن کی طرف اشارہ کیا تو "ھُم" کہا جس سے معلوم ہوا کہ یہ جاندار و ذی روح تھے۔ تو صاف ہو گیا نا مطلب! کہ بتائے تھے نام اور امتحان یہ تھا کہ تم پہچان بھی گئے کہ یہ کس کے نام ہیں؟ آدمؑ نے عرض کی "جی ہاں خوب پہچان گیا" اور ملک نے کہہ دیا کہ "نام سب یاد ہیں مگر ہم پہچانتے نہیں کہ وہ کیا ہیں" تو معلوم ہوا کہ آدم سب کچھ جانتے تھے اور ابتدائے خلقت ہی میں ہر شئی کو پہچانتے تھے۔

اب اگر کوئی صاحب اعتراض کر دیں کہ روایت تو کہتی ہے کہ صرف محمدؐ و آلِ محمدؐ کی ذاتیں آدمؑ کے سامنے پیش کی گئی تھیں اور محض انھیں حضرات کے نام دریافت کئے گئے تھے لہٰذا اگر آدمؑ پہچانتے تھے تو صرف انھیں حضرات کو تم نے یہ کیونکر کہہ دیا کہ ہر شئی کو جانتے تھے" تو یہ بالکل صحیح ہے کہ نام تو کل بتائے گئے تھے اور مقام امتحان میں ذاتیں صرف معصومین کی پیش کی گئی تھیں۔ مگر یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ نام صرف اِنھیں حضرات کے تھے بلکہ یہ اس وجہ سے تھا کہ ہر امتحان کرنے والا پوری تعلیم کا امتحان نہیں لیتا بلکہ چند ضروری اور اہم چیزیں دریافت کر کے کامیابی یا ناکامی کی سند دیتا ہے۔ کتاب آپ نے پڑھائی ہے دو سو ورق کی مگر سوال کا پرچہ آپ نے دیا تو صرف پانچ سات سوال۔ فرمائیے یہی ہوتا ہے نا؟ تو خدا نے بھی یہی کیا کہ پڑھائے لاکھوں نام مگر امتحان کے پرچے میں صرف چودہ ۱۴ سوال کہ یہ سب سے زائد اہم اور ضروری ہیں۔ اگر تم نے ان کو پہچانا تو ہر شئی جان گئے اور اگر انھیں کو نہیں پہچانتے تو

پھر سب بیکار۔

میرے اس دعوے پر دوسری دلیل یہ ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ خدا نے علیؑ کو علمِ آدمؑ عطا کر دیا تو اگر آدمؑ کا علم اتنا ہی تھا کہ چہاردہ معصومین کے نام معلوم تھے تو یہ تو ہم کو بھی معلوم ہیں۔ اتنا معلوم ہو جانا نہ آدمؑ کے واسطے فخر کا باعث تھا، نہ علیؑ کے واسطے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ علمِ آدمؑ کچھ ایسا ہی ناپیدا کنار دریا تھا جو میراث میں علیؑ کے سے عالم و فاضل و حکیم کو ملا اور رسولؐ نے مقامِ مدح میں پیش کیا کہ اگر آدمؑ کو ان کے علم میں دیکھنا چاہو تو علیؑ کو دیکھو۔ اور فقط علمِ آدمؑ ہی نہیں بلکہ ہیبتِ نوحؑ، مناجاتِ موسیٰؑ، زہدِ عیسیٰؑ، خلتِ ابراہیمؑ، سب کا مظہر اگر کوئی ہے تو میرا بھائی علی ابن ابیطالبؑ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ۔

میری اس تمام تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ ہماری قدرت، اور ہمارا اختیار، ہر چیز کا ہمارے قبضہ اور اختیار میں ہونا اس کا اصلی مرکز اور حقیقی سبب علم ہے اور حکومتِ الٰہیہ کے ہر نائب نے اس دنیا میں آکر سب سے پہلے علم ہی پر زور دیا اور علم کی تمام قسموں میں سب سے زائد خدا کی معرفت اور اس کی ذات کو پہنچوایا کیونکہ پوری اور حقیقی قوت و قدرت کا مرکز صرف اسی کی ذات ہے۔ جس کسی میں بھی کسی قسم کی قوت اور قدرت آتی ہے اُسی کی عطا سے آتی ہے مرکزِ علمِ حقیقی بھی وہی اور مرکزِ قدرت کا ملہ بھی وہی ہے۔ لہٰذا ہر نبی نے بتایا کہ خدا کو پہچانو کہ علمِ حقیقی وہی ہے جو اُس سے ملے۔ مدد مانگو، قوت و قدرت وہی ہے جو وہ عطا کر دے۔

دنیا اس وقت اپنے معلومات پر اکڑ تی ہے مگر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مرکزِ علوم ذات باری ہی ہے، معلم ان تمام علوم کا وہی ہے۔ نہ فرمایئے گا کہ یہ ہمارے معلومات خدا کی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہیں ان کو تو ہم نے خود اپنی سائنس اور اپنے تجربے سے حاصل کیا ہے۔ غلط اور بالکل غلط، مانا میں نے کہ یہ جزئیات اور یہ تفاصیل آپ نے تجربے سے حاصل کئے مگر جب ان کی اصل اور بنیاد پر آپ نگاہ کریں گے تو آپ کو اقرار کرنا پڑے گا کہ اصل اس کی انبیاء ہی سے ہے۔

کسی معلم کے واسطے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ہر ہر چیز کو تفصیل سے بتائے۔ جزئیات کی ایک ایک فرد کسی سیکھنے والے کو اپنے ہاتھ سے کر کے سکھائے۔ مثلاً ایک درزی سے کوئی بچہ سینا پرونا سیکھ رہا ہے تو اس درزی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کا کپڑا سی کے بتائے کہ یہ یوں سینا، جی نہیں اس نے مشین چلانا سکھا دی اور مشق کرا دی اب کوٹ، صدری، قمیص، تم خود دیکھ لینا۔ سینے کی جتنی قسمیں ہیں وہ سکھا دیں، اب تراش خراش، بدن کے لباس کی مختلف وضعیں تم خود بنا لینا۔ کوئی لوہار ہے اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ لوہا پیتل تانبہ رانگہ گلانے کی ترکیب، سانچہ بنانے کا انداز شاگرد کو بتا دے اب اگر شاگرد مختلف سانچوں میں مختلف قسم کے پرزے ڈھال کر ایک نئی مشین بنا دے، تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کو کسی نے سکھایا نہیں۔ یوں ہی ہر چیز کی اصل و بنیاد اس کی ابتدا خدا ہی کی طرف سے ہے اور اس کی بنیادی تعلیم کا مرکز جب آپ کو ملے گا تو کوئی نہ کوئی نبی ہی ملے گا۔

یوں ہی قدرت کہ اس کا اصلی مرکز ذات خالق کے سوا کوئی نہیں۔

اسی کی تعلیم دی ہے شریعت نے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ سے۔ کوئی
قوت وطاقت اور کسی قسم کا اختیار و اقتدار ممکن نہیں مگر صرف خدا کی طرف سے"۔
اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ہمارا تمام زور ہماری تمام قوت و قدرت کا مرکز اگر کوئی
ہے تو صرف اللہ۔ اسی نے ہم کو ہاتھ دیے اور ان ہاتھوں میں گرفت کی قوت
دی کہ ہم ہزاروں کام انھیں ہاتھوں سے روز کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی مشیت
ہوئی اور فالج نے قبضہ کیا تو اب دونوں بیکار۔ زبان سے ہم ہزاروں کام
لیتے ہیں، ہر طرح کی تعلیم دیتے ہیں، ہر قسم کے حکم دے کر دوسروں سے اطاعت
لیتے ہیں۔ لیکن جس دن لقوے کی حکمرانی ہوئی اس دن سے تمام باتیں خاموشی
سے بدل گئیں۔ آنکھیں ہزاروں کام کر رہی ہیں، ہر چیز کی دیکھ بھال آنکھوں
ہی سے متعلق ہے مگر جس دن بصارت نے جواب دیا اسی دن صورت دیکھنے کو
بھی ترس گئے۔ اب فرمائیے کہ قوت کتنی ہے قدرت کس حد پہ ہے نہ ہاتھ سے
کچھ کر سکتے ہیں، نہ زبان سے کچھ بول سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے کچھ دیکھ سکتے ہیں۔
اور جانے دیجئے یہ سب کچھ ہاتھ بھی ہیں، زبان بھی کام کر رہی ہے آنکھوں
کی بصارت بھی خدا نے نہیں چھینی مگر قوت حافظہ لے لی۔ سب کچھ پڑھا لکھا تھا
ہزاروں سائنس کے مسئلے حل کئے تھے مگر حافظہ نے جو ساتھ چھوڑا تو سب بھولے
غالب مرحوم کو کہنا پڑا ے

"یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں"

اب فرمائیے کتنی طاقت ہے کس قدر قدرت ہے؟ جی کچھ نہیں سب ختم!! اسی کی طرف

خالق نے ارشارہ کیا ہے وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا "خدا ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور وہی تم کو قوت بھی دیتا ہے ہاں تم میں بعض وہ بھی ہیں جن کی عمریں بڑھا کر نکمی زندگی تک پہنچا دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے بعد اب کچھ نہیں جانتا"

اب فرمائیے کتنی قدرت ہے کیا طاقت ہے! بے اختیاری کا عالم، بے حسی کی منزل ہے۔ دماغ کی تمام منزلیں ویران، احساسات کا ہر خزانہ خالی، قوت کی ہر راہ بند، بلند ہوتا ہوا قد خمیدہ، عالی دماغی کے گوشہ میں پستی، نہ علم رہ گیا نہ قدرت، سب ختم!!

اور اگر یہ بھی نہ ہو تو بندہ نواز، جن چیزوں کے اثرات، جن اشیاء کی قوت کا تجربہ کر کے ہم نے اپنی قوت و قدرت بڑھائی، اُن چیزوں کا اثر، ان کی طاقت کس کا عطیہ ہے اور کس کے قبضہ میں ہے؟ کہنا پڑے گا کہ صرف اللہ۔ وہی ہے جس نے ہر شئی پیدا کی اور ہر شئی کے مختلف اثر قرار دیے۔ جس وقت تک وہ چاہے ہر شئی میں وہ اثر موجود جس سے ہم کام لے رہے ہیں اور جس دن اُس نے نہ چاہا اسی دن ہر شئی بے اثر ہے تو چھری میں کاٹ دینے کی قوت لیکن جس دن جناب ابراہیمؑ نے جناب اسمٰعیلؑ کی گردن پر چھری پھیرنے میں ساری قوت ختم کر دی، اس دن جناب اسمٰعیلؑ کی رگِ گردن کیوں نہ کٹ گئی؟ ہے تو آگ میں جلانے کا اثر مگر جس دن نارِ نمرودی میں ابراہیمؑ آئے تو کیوں نہ جلا دیا؟ شہر کے شہر پھونک دیئے آگ نے مگر جب وہاں کا حکم آیا يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا "بس ٹھنڈی ہو جا" تو کیا ہو گئی وہ

گرم بازاری ؟ اگر شمعِ حیات آتشِ گُل ہو کے گلزار بنتی تو تعجب نہ ہوتا۔ مگر جب شعلہ فشانی باقی رہی اور آگ کے انگارے گُل لالہ بنے، اور قدرت کی گل کاری نے چمن بنا دیا تو آگ کا ایک ایک پھول پھولوں نہ سمایا اور پھولوں کی مہک پھیل نکلی۔

ہے تو پانی کی طبیعت میں روانی اور دریاؤں کا بہاؤ کسی کے روکے نہ رُکا مگر جب جناب موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کے رودِ نیل میں آئے تو کیوں سیال جامد بنا؟ اور کیوں مزاج کی روانی سکون سے بدلی؟ ڈبو دیا ہوتا کلیم خدا کو مع لشکر کے، مگر قدرت کی بندشوں نے یوں جکڑ بند کیا کہ حیران ہو کے وہ آئینہ بنا جس میں بنی اسرائیل کے واسطے شکل رحمت تھی اور فرعون کے واسطے صورت عذاب۔ وہ تیزی کدھر گئی؟ وہ موجوں کا تلاطم کیوں تھما؟ وہ گرداب کی گردشیں کیوں ختم ہوئیں؟ وہ چادر آبی کیوں سمٹی؟ حباب نے آنکھیں کیوں بند کیں؟ موجیں ماہیِ بے آب بن کے تڑپیں مگر قدرت کی حدوں سے باہر نہ نکلیں۔ گرداب نے دورِ فلک نگاہِ یاس سے دیکھا اور حکم کے دائرے سے باہر نہ نکلا۔ پانی کی چادریں دھجیاں بنیں مگر بنی اسرائیل کو ڈھانک نہ سکیں، حبابِ بحر پھوٹ پھوٹ کے روئے مگر کلیم کے دامن تک چھینٹ نہ آئی۔

زہر میں موت کا اثر ہے۔ یقیناً اس کی تاثیر ہے ہلاک کرنا۔ مگر جب علیؑ نے طبیب سے لے کر کل دوا نوش کر لی تو کیوں نہ چہرے کی زردی بڑھی، کیوں نہ علیؑ نے شہادت پائی؟ پھول سے رخسار کیوں دمک گئے اور گلابی رنگ کیوں دوڑ گیا۔ پسینہ بن کے عرق ٹپکا اور چہرے کی تازگی اور بڑھی۔ اب

فرمائیے کہ قدرت آپ میں ہے یا خالق میں ہے؟ اختیار آپ کا ہے یا خدا کا ہے؟ اسی کی تعلیم شریعت نے دی کہ ہر وقت کہو ہر ساعت کہو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ "ہم میں نہیں کوئی قدرت نہیں کوئی طاقت نہیں، بس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہے، وہ اجازت دے تو سب کچھ اور وہ نہ چاہے تو کچھ نہیں"۔

بہرحال عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہر صنعت و حرفت، اور اس کے کرشمے جو کچھ بھی ہیں، وہ سب قدرت پر موقوف ہیں - اور قدرت اگر حاصل ہوتی ہے تو علم سے - لہذا سلطان حقیقی نے، سلطان السلاطین اور مالک الملک نے سب سے پہلے اپنی رعایا اور اپنے بندوں کو علم دیا اور تعلیم و تعلّم کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد جب صنعت و حرفت کی طرف توجہ کی تو کبھی جناب داؤدؑ کو زرہ بنانا سکھائی وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ "ہم نے تمھاری حفاظت کے واسطے اپنے نبی داؤدؑ کو زرہ بنانا سکھادی" یعنی قدرت نے بتادیا کہ لوہا، لوہے ہی سے رُک سکتا ہے، اب یہ تمھاری عقل و فہم کا کام ہے کہ داؤدؑ ہاتھوں سے لوہا زم کرلیں تم آگ سے پگھلا کر لوہے سے کام لے لینا ہم تم کو حفاظت کا گر بتائے دیتے ہیں اب مختلف صورتیں تم بنالینا۔ زرہ بنانا ہم نے بتادی خود و بکتر یا آہن پوش گاڑیاں یا جہازتم بنالینا - اور اگر تم کو لوہے کا گلانا اور اس کو مختلف صورتوں میں ڈھالنا نہ آتا ہو تو ہم اسی داؤدؑ کے فرزند سلیمانؑ کو سب کچھ بتائے دیتے ہیں وہ تم کو بتادیں گے کہ ہر قسم کی دھاتیں کیونکر گلائی جاتی ہیں، کیونکر ان سے برتن بنتے ہیں، کیونکر آلاتِ حرب درست

ہوتے ہیں، کس صورت سے ہوا قبضے میں آتی ہے، کیونکہ سیمہ گلا کے بڑے سے بڑے قصر تیار ہوتے ہیں۔

فرض ہے اور ہر سلطنت کا، کہ وہ اپنی رعایا کے واسطے صنعت وحرفت کی آسانیاں فراہم کرنے کے لیے ہر قسم کے سامان جمع کردے تو مالک الملکِ حقیقی نے بھی ایسا ہی کیا۔ کہیں دریاؤں کی تہوں میں موتی اور مرجان بنائے۔ کہیں معدن کے دامن میں لوہا، پیتل، سونا، تانبا اور کُل دھاتیں پیدا کردیں۔ کہیں پہاڑوں کے خزانوں میں لعل ویاقوت، ہیرا اور پنّا پیدا کیے، کہیں گندھک کے چشمے زمین سے اُبل کے نکلے۔ کبھی ہوا کی لہروں میں بجلی کی طاقت بنادی، کہیں مقناطیس اور کہربائی طاقتیں خلق کیں یعنی وہ تمام چیزیں جن سے ہم اس وقت کام لے رہے ہیں یا آئندہ کام لیں سب خدا ہی نے پیدا کردیں اور ان سے کام لینے کا گرُ ہم کو تعلیم دے دیا۔ کام لینا نہ لینا ہمارا کام ہے۔

کہہ تو دیں گے آپ اور ہر انسان کہ یہ ہم نے بنایا، وہ ہم نے بنایا، یہ ہماری حرفت، وہ ہماری صنعت، مگر توبہ، بنانا کہاں اور ہم کہاں!! حقیقت یہ ہے کہ آج تک ہم نے کچھ بھی نہیں بنایا اور ایک چیز بھی نہیں بنائی۔ جو کچھ بنایا، خلق کیا، پیدا کیا وہ صرف اللہ نے۔ ہاں اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی شکل بدل کے کچھ ہم نے بھی بنایا۔ اس کی خلق کی ہوئی چیزوں میں ترکیب دے کے صنعت ہم نے بھی دکھائی۔ پیدا کرنا اور خلق کرنا صرف خدا ہی کا کام تھا اور اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے اپنے علم کے بقدر کام لینا ہمارا کام۔

پیدا خدا نے کیا اور کام انسان لے۔

انھیں دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی آیت اُتری اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ "خدا ہی نے آسمان بھی بنایا اور زمین بھی"۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً "اور خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا"۔ اس جملہ میں پانی سے ہوا بننے اور بلند ہو کے پھر پانی بن جانے اور اشک حسرت کی طرح چشم فلک سے ٹپک پڑنے کے تمام اشارے موجود ہیں۔ صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ یہ پانی کیونکر برستا ہے کس صورت سے پانی گرمی پا کے ہوا بنتا ہے اور کس طرح ہوا ٹھنڈک پا کے پانی بنتی ہے۔ اسی ایک اشارۂ قدرت سے دُنیا نے عرق بنانا سیکھا، بھاپ اور اسٹیم بنانا سیکھا اور اسٹیم سے تمام دُنیا کی مشینیں چلانا سیکھیں۔

اب اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ "تو اسی برسے ہوئے پانی سے وہ پھل نکلے جن میں تمھاری غذا ہے۔ بتا دیا کہ زراعتیں کیونکر بار آور ہو سکتی ہیں اور کس طرح ان میں پھل آتے ہیں اور وہ پھل تمھارا رزق اور ذریعہ حیات ہیں۔

یہاں تک اپنی خلقت اور اپنے کمال قدرت کا زور اور مختلف چیزوں کی تعلیم کی طرف اشارہ تھا۔ اب اس کے بعد آیت آگے بڑھتی ہے تو انداز بدلتی ہوئی وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ "خدا ہی نے کشتیوں کو تمھارا فرمانبردار کر دیا جو خدا کے حکم سے دریاؤں میں چلتی ہیں"۔ یہی وہ چیز ہے جس سے جہاز رانی کی بنیاد پڑی۔ ہم میں کب یہ قدرت تھی اور

کہاں یہ زور تھا کہ دریا کی موجیں راہ روی کے جادے پیش کریں اور دریا کی لہریں ہماری سواریوں کو رواں کر دیں۔ پانی کی چادریں ہمارے دامنِ حیات کو ڈھانک لیتیں اگر خدا نہ بچاتا۔ موجِ حوادث کا ایک تھپیڑا ایسا تہ نشین کر دیتا کہ قیامت تک ابھرنا ممکن نہ ہوتا۔ اگر اس کے اشارے نہ ہوتے ہر گرداب اپنے حلقے میں لے کر یوں قید کرتا کہ تمام عمر رہائی مشکل ہوتی۔

مگر بچایا ہر طوفان سے تو اسی نے، چلائی کشتی ہر تلاطم میں تو خدا ہی نے۔ یعنی پہلے تو خود کشتی بنانا سکھائی اور ارشاد ہوا جناب نوحؑ سے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا "اے نوحؑ ہماری نگرانی میں اور ہماری تعلیم سے کشتی بناؤ"۔ یہ پہلی کشتی تھی جو خدائی تعلیم سے بنائی گئی اور خدا کے حکم سے پانی پر تھمی، اور بغیر ناخدا کے صرف خدا کے اشاروں پر طوفانی ہواؤں میں چلی۔

ہر جانور کا ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کیا گیا۔ انسانیت کے وہ اسّی نمائندے جو ایمان میں بھی کامل تھے اس سفینۂ نجات میں بٹھائے گئے۔ اور تنور سے آگ کی جگہ پانی اُبلا۔ گھنگھور گھٹائیں سروں پر چھائیں، اور ہر چشمہ جوش میں آیا۔ دریا بڑھے، نہریں اپنی حدوں سے باہر نکلیں، عالم کی کل زمین سمندر بنی اور فلک کا پانی جو ہمیشہ رحمت تھا غضبِ الٰہی بن کے برسا۔ بوندیاں نہ تھیں، موسلا دھار بارش نہ تھی، پانی کی چادریں تھیں جو ہر بلند پرواز کو ڈھانکے لیتی تھی، بلکہ پہاڑ کے پہاڑ تھے جو زمین کے سر بلند پہاڑوں کو تہ نشین کئے دیتے تھے۔ وہی پانی جو ذریعۂ حیات تھا پیغامِ موت بنا۔ خشکی نگاہوں سے اوجھل ہوئی نام کو بھی زمین نمایاں نہ رہی۔ ہر جان دار

دیبجان عذاب کے پانی میں ڈوبا۔ ہر منزلِ حیات کی گرم بازاری ٹھنڈک سے بدلی، اور کشتیٔ نوح ذخیرۂ حیات کا مرکز بنی۔

چشمِ فلک نے آفتاب و ماہتاب کی عینک لگا کے تلاش زمین کی، شعاعِ مہر نے پانی کی تہوں میں ڈوب ڈوب کے کافروں کی بستیاں ڈھونڈ لیں مگر ہر تلاش بے کار گئی، نہ زمین ملی نہ شہر، نہ آبادیاں ملیں نہ بسنے والے۔ پانی تھا اور فلک تھا، سناٹا تھا اور ویرانی تھی۔ ہاں تمام دنیا کی آبادی سمٹی ہوئی تھی تو اس ایک سفینہ میں جو ہر موج کو روکتا ہوا ہر تلاطم سے ٹکراتا ہوا ذخیرۂ حیات ایمانی کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے، بیٹھنے والوں کی حفاظت کی قسم کھائے ہوئے تمام عالم کی سیاحت کر رہا تھا۔ یہی وہ کشتی تھی جو پہلے پہل بنی اور یہی جہاز تھا جس کو پانی کی زم جادروں پر قائم کر کے حکم باری نے قدرت دکھائی اور قرآن کی آیت موجِ آب میں حق ہو کے ابھری وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ "خدا نے اپنے حکم سے کشتیوں کو مسخر کر دیا کہ وہ دریاؤں میں چل رہی ہیں"۔ حق بھی یہی ہے کہ ایک کنکری تو پانی پر تھمتی نہیں، اتنی بڑی کشتی ہزاروں من بوجھ لاد کے کس طرح تھمتی۔ یہ صرف اسی کا حکم تھا، اسی کا انتظام تھا، اسی نے طبقات عالم میں ہوا کو بلند اور پانی کو پست قرار دیا، اسی نے جذب مرکزی پیدا کیا، اسی نے ہر شئے میں خلا کو محال قرار دیا، اس وجہ سے جس چیز میں ہوا موجود ہوگی وہ بھاری بھرکم جسم کو بھی بقدر اپنی قدرت و قوت کے تہ نشین نہ ہونے دے گی۔

دکھا دیا قدرت نے دریا تمہارے سفر کی راہیں روک رہا تھا تو ہم نے

تمھارے واسطے یہ سواریاں بنائیں جو تمھاری مطیع ہیں، تمھاری فرمانبردار ہیں، جس طرف چاہے جاؤ اور جس طرح چاہے کام لو، سیاحت کرو، شکار کھیلو، سب کچھ ہمارے واسطے ممکن۔

اب یہاں سے آیت اور بڑھی تو انسانی اختیارات کو اور بڑھاتی ہوئی ارشاد ہوا وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ "ہم نے نہروں کو تمھارا مطیع کر دیا"۔ یہ انسانی اقتدار کا ایک زبردست اعلان تھا اور گویا قدرت کا اشارہ تھا کہ یہ بہتی ہوئی نہریں مخلوق ہماری، مگر مطیع تمھاری۔ چاہے ان کو بہا کے اپنے گھروں میں لے جاؤ اور چاہے باغوں میں آبپاشی کرو۔ اس پانی سے ہزاروں قسم کے فائدے اُٹھاؤ، یا اس سے بھاپ اور اسٹیم بنا کے مشینیں چلاؤ، یا ان کے تیز دھاروں سے بجلی پیدا کرو۔ یہ لہریں ہر کام تمھارا سر جھکا کے انجام دیں گی اور ان کے ذریعے سے تم کو ہزاروں فائدے حاصل ہوں گے۔

پانی کی نرم مزاجی اور اطاعت شعار طبیعت کا ذکر کر کے آیت ختم نہ ہوئی بلکہ ارشاد ہوا وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ "خدا ہی نے معینہ راستوں پر چلتے ہوئے آفتاب و ماہتاب کو تمھارا فرمانبردار کر دیا اور دن و رات بھی تمھارے مسخر ہی ہیں"۔ ہے تو یہاں بھی وہی لفظ تسخیر جو کشتیوں اور نہروں کے واسطے ارشاد ہوئی، مگر یہاں تسخیر کے معنی سمجھنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کشتیاں ایک حد کے اندر ہماری ضرور مطیع ہیں اور نہریں بھی کچھ نہ کچھ تو ہمارا حکم مان ہی لیتی ہیں، آفتاب و ماہتاب، دن و رات ہمارے مطیع

کیونکر اور ان چیزوں پر ہمارے اقتدار و اختیار کے معنی کیا؟ یہ بڑی سخت منزل ہے۔ اگر یوں کہہ دیا آپ نے کہ تسخیر سے مطلب یہ ہے کہ ان تمام چیزوں میں فائدہ تمھارا ہے، تو بالکل صحیح، وہ کون چیز عالم کی ہے جس میں ہمارا فائدہ مضمر نہیں۔ خود سر انسان، مغرور انسان، احسان فراموش بندے اپنی قوتوں پر ناز کرتے ہیں، اپنے زور بازو پر اکڑ کے چلتے ہیں۔ بصارت و سماعت پر مغرور ہو جاتے ہیں، دولت کی کثرت دماغوں کو خراب کر دیتی ہے، نعمتوں کی فراوانی غافل کر دیتی ہے مگر یہ بد دماغ کبھی نہیں دیکھتا کہ یہ سب کس نے دیا اور کس کی عطا ہے۔ ہم ان تمام چیزوں میں کس کے ممنون احسان ہیں۔

آپ یاد رکھیں کہ دنیا میں جو کچھ خدا نے بنایا ان سب کی آخری غرض ہم ہی ہیں۔ یہ زمین کا فرش اور یہ آسمان کا شامیانہ ہر چیز کے واسطے مگر ہر چیز کا آخری فائدہ ہمارے لئے۔ آفتاب و ماہتاب سے سب ہی نے فائدہ اٹھایا مگر جس نے جس نے بھی فائدہ اٹھایا اس کا آخری ثمر انسان کے واسطے۔ پانی سے درخت اُگے، درختوں سے حیوان پلے مگر حیوان کس کے واسطے، ہمارے لیے۔ شعاع شمس و قمر سے پہاڑوں کے دامن میں جواہرات بنے، مگر جواہرات کس کے واسطے، کہنا پڑے گا کہ ہمارے واسطے۔ تو اقرار کیجیے گردش شمس و قمر اور تمام دن و رات کی دوڑ دھوپ آنے جانے والے فصلوں کے تغیّر و تبدّل سے آخری فائدہ انسان کا اور صرف انسان کا۔ یہی ارشاد خالق بھی ہے کہ ہم نے تمھارے نفع کے واسطے آفتاب و ماہتاب اور دن و رات کو فرمانبردار کر دیا۔ آیت کے یہ معنی کہہ کر تو سمجھ لینا بہت آسان لیکن اگر یوں فرمائیے کہ نہیں یہ چیزیں بھی

انسانوں کی مطیع، تو یا تو عموم آیت کو بدل کے مخصوص کرنا پڑے گا اور کہنا پڑیگا کہ ہر انسان وہ نہ تھا جس سے ارشاد ہوا کہ یہ آفتاب و ماہتاب دن و رات تمھارے مطیع۔ بلکہ وہ خاص انسان تھے جن سے ارشاد ہوا کہ جو تم حکم دو وہ آفتاب کرے، اور جو تمھاری فرمائش ہو اس کی تعمیل ماہتاب کرے۔ کہو تو رات دن بن جائے اور اشارہ کرو تو دن شب تار ہو جائے۔

یا اگر آپ آیت کا عموم باقی رکھتے ہیں تو پھر یوں کہیے کہ تمام انسانوں کو تعلیم دی جا رہی تھی کہ آفتاب کی شعاعوں میں، اس کی پیدا کی ہوئی گرمی میں، چاندنی کی لہروں میں، اور ماہتاب کی پیدا کی ہوئی خنکی میں، دن کی روشنی میں، اور رات کی سیاہی میں سیکڑوں قوتیں، سیکڑوں اثر پوشیدہ ہیں اگر تم ان کو معلوم کر لو اور ان سے کام لینا چاہو تو یہ تمھاری اطاعت کریں گے اور تمھارے کام آئیں گے۔

اس آیت میں تو چند ہی چیزوں کا تذکرہ تھا۔ مگر بعض آیتیں اور بھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اختیارات کی حد نہیں، اس کے اقتدار کی انتہا نہیں۔ سورۂ جاثیہ میں ارشاد ہوتا ہے وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ "آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا نے اپنے حکم سے تمھارا فرمانبردار کر دیا" تو معلوم ہوا کہ سلطان السلاطین نے ہماری عملی قوتوں کو برسر کار لانے کے واسطے پہلے تو ضرورت کی ہر شئے پیدا کی، اور پھر ہر شئے کو ہمارا مطیع و فرمانبردار بنا کے ہم کو ان تمام چیزوں سے کام لینے کی طرف مائل کیا۔ پھر مختلف انبیاء و مرسلین کے ذریعے سے صنعت و حرفت کی

تعلیم دلوا کے عملی زندگی کی طرف مائل کیا۔ آپ نہ جانتے ہوں گے کہ جناب داؤدؑ کو زرہ بنانا کیوں سکھائی گئی، سنیئے، میں عرض کروں کہ جناب داؤدؑ فقیر نہ تھے، محتاج نہ تھے، مالدار تھے، دولتمند تھے، کنیز و غلام کے مالک تھے، سلیمانؑ کی سی سلطنت نہ سہی مگر بادشاہ تھے، لشکر تھا، خزانہ تھا، اور پھر خدا کے نائب بھی تھے۔ مگر ایسے سلطان نہ تھے کہ اتنے عالی شان محل بنائیں جو ان کی ضرورت سے بہت زائد۔ ویسا زرتار لباس پہنیں جو رعایا کو میسر نہ ہو۔ مگر اس زہد و اتقا کے ساتھ یہ ضرور ہوتا تھا کہ اپنے اخراجات بقدر حاجت خزانۂ شاہی یعنی بیت المال سے نکال لیا کرتے تھے۔ ایک دن عالم مناجات میں ارشاد رب العزت ہوا کہ "داؤد ایک بات تمھاری ہم کو پسند نہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو تمھاری ہر بات ہم کو پسند ہے"۔ عرض کی "میرے مالک بتا دے کہ وہ کیا ہے، تو میں ترک کر دوں"۔ ارشاد ہوا کہ "تم اپنے اخراجات بیت المال سے لیتے ہو اچھا ہوتا کہ اپنی محنت سے پیدا کرتے"۔ بس یہ دن اور عمر کی آخری ساعت۔ جب سے داؤد نے پھر کبھی بیت المال سے کچھ نہ لیا، زرہ بنا کر بیچی اور اسی سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی عمر بسر کی۔ اب انصاف فرمائیے کہ کیا یہی بے عمل زندگی ہے جس کی تعلیم قدرت نے دی۔ بیت المال حکومت الٰہیہ کا خزانہ ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے جائز رکھا ہے، اجازت دی ہے کہ جتنے حکومت الٰہیہ کے ارکان دولت ہیں، خدام سلطنت ہیں، کارندے ہیں وہ سب بقدر ضرورت بیت المال سے اپنے اخراجات لیں۔ لہٰذا اگر جناب داؤد بھی لے لیتے تھے تو کوئی جرم نہ تھا، گناہ نہ تھا مگر نہیں قدرت کو منظور یہ تھا کہ

دنیا کو صنعت و حرفت اور محنت و مشقت کی طرف مائل کر دوں اور دکھا دوں کہ مجھ کو با عمل زندگی پسند ہے۔ بے عمل زندگی، بیکار زندگی ہرگز پسند نہیں۔ یہی خاص سبب تھا کہ تمام معصومین بے عملی کی زندگی ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ علیؑ باغوں میں مزدوری کرتے تھے، سیدہؑ گھر میں چرخہ چلاتی تھیں، چکّی پیستی تھیں۔ رسولؐ کی پارۂ جگر کی یہ محنت و مشقت اور یہ عملی تعلیم زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب رسول کی پارۂ جگر کی زندگی کا آخری دن تھا اور علیؑ ابن ابی طالبؑ گھر میں تشریف لائے تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت فاطمہ زہراؑ ایک ساتھ مختلف کاموں کو انجام دے رہی ہیں۔ بچوں کے لیے آٹا بھی خمیر کیا ہے، کپڑے بھی دھو رہی ہیں اور شاہزادوں کے نہلانے کا بھی انتظام فرما رہی ہیں۔

علیؑ ابن ابی طالب نے ارشاد فرمایا "رسولؐ کی بیٹی! میں نے آپ کو ایک ساتھ کئی کام کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، آپ ہر شئی کو اس کے محل پر انجام دینے کی عادی ہیں پھر کیا سبب ہے کہ آج اتنے کام ایک ساتھ انجام دے رہی ہیں؟" فاطمہ زہراؑ نے جواب دیا کہ "اے ابو الحسن! آج میری زندگی کا آخری دن ہے اور دل چاہتا ہے کہ اپنے بچوں کی زائد سے زائد خدمت کروں"۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مرض کی اس شدّت میں، کمزوری اور ضعف کے اس عالم میں آخر حضرت فاطمہؑ زہرا ہی یہ تمام کام انجام کیوں دے رہی تھیں۔ گھر کی کنیز فضّہ بھی تو موجود تھی، اس سے کچھ کام لے لیا ہوتا! اس سوال کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ زندگی کے

آخری دن بھی فاطمہ زہراؑ کو باوجود اپنی تمام کمزوری اور ناتوانی کے باپ کا وہ حکم یاد تھا کہ "بیٹی گھر کا سارا کام ایک دن تم کرنا اور ایک دن فضہؓ سے لینا"۔ ماں کی یہی کنیز نوازی تھی جو حسینؑ ابن علیؑ کو وراثت میں ملی۔ یہ ماں کی منزل تھی کہ عمر کے آخری دن کنیز کو کام کرنے کی اجازت نہ دی اور وہ بیٹے کا کردار تھا کہ جب رخصتِ آخر کے لیے خیمہ میں آئے تو جہاں اپنی بہن جناب زینبؑ کو سلام کیا، اپنی ماں جائی اُم کلثومؑ کو سلام کیا، جناب رقیہؑ اور اُم لیلیٰؑ کو سلام کیا، اپنی چھوٹی بچی کو سلام کیا وہاں چلتے وقت یہ بھی فرمایا کہ میری ماں کی کنیز فضہ تو بھی حسینؑ کا آخری سلام قبول کر لے۔

بات نامکمل رہ جائے گی اگر حسینؑ کی کنیز نوازی کا ذکر ہو اور غلام نوازی کا ذکر نہ ہو، اس لیے آخر کلام میں ایک غلام کا ذکر کر کے آپ کی زحمتوں کو ختم کروں۔

کون غلام؟ حضرت ابوذر کا غلام جونؑ، حبش کا رہنے والا، سیاہ رنگ، مجہول النسب، زندگی بھر حضرت ابوذرؓ کے ساتھ رہا۔ جب حضرت ابوذرؓ کا انتقال ہوا امام حسین علیہ السلام نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ جب میدانِ کربلا میں امام حسینؑ کے کچھ جاں نثار امام کے قدموں پر اپنی جان نثار کر چکے تو اب یہ غلام قریب آیا، "آقا اب مجھے بھی مرنے کی اجازت دیجئے"۔

اللہ رے حسینؑ کی عالی ظرفی! فرماتے ہیں "جون! تو، تو ہمارے ساتھ نعمت میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا، اب کیوں اپنی جان کھوتا ہے، میں اپنی بیعت تیری گردن سے بخوشی اُتار دیتا ہوں، جا چلا جا، جس طرف دل چاہے چلا جا! یہ لشکر جب مجھے پالے گا تو پھر کسی کی تلاش نہیں کرے گا"۔

عزادارانِ حسینؑ ! امام حسینؑ کے بہت سے جاں نثار ایسے ملتے ہیں جن کو امام نے مرنے کی رخصت پس و پیش کے بعد دی تھی۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب امام پس و پیش فرماتے تھے تو وہ مجاہد ہاتھوں کے بوسے لیکر قدموں پر سر رکھ کر، خوشامد کر کے آخر مرنے کی اجازت لے ہی لیتا تھا۔ یہی انداز عباسؑ کا ملتا ہے، یہی قاسمؑ کا اور یہی علی اکبرؑ کا۔

مگر جب امام نے جوَن کو اجازت دینے میں توقف فرمایا تو جوَن نے خوشامد نہیں کی، ہاتھوں کو نہیں چوما، قدموں پر سر نہیں رکھا بلکہ یہاں انداز بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ تیوریوں پر بل ڈال کر کہتا ہے "آقا! میں سمجھا! میرا نسب مجہول ہے، میرے جسم سے بوئے بد آتی ہے، میرا رنگ سیاہ ہے، آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے نورانی خون میں میرا سیاہ خون ملے! تو آقا! آج تو میں نے طے کر لیا ہے کہ آپ کے نورانی خون میں اپنے سیاہ خون کو ملا کر رہوں گا۔" اب امام کیا جواب دیں، امام سر جھکائے خاموش ہیں غلام نے لشکر پر حملہ کیا اور انتہائی شجاعت کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو قتل کیا آخر زخموں سے چُور ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اور اب یہ حسینؑ کی قدردانی تھی کہ جہاں حسینؑ عباسؑ کی لاش پر گئے، قاسمؑ کی لاش پہ گئے، علی اکبرؑ کی لاش پہ گئے وہاں جوَن کے سرہانے بھی پہنچے۔ جلتی ہوئی زمین پر بیٹھے، جوَن کا سر اٹھا کر زانو پر رکھا، جوَن نے آنکھ کھول کر امام کی زیارت کی اور مسکراتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔ امام جوَن کے سرہانے دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ پھر اٹھے دستِ دعا بلند کر دیے "پالنے والے! جوَن کو اپنی رنگت کی سیاہی کا احساس تھا، اپنے جسم سے آنے والی بوئے بد کا خیال تھا تو میرے مالک اس کے جسم کی بوئے بد کو خوشبو سے، اور اس کی سیاہی کو نور سے بدل دے۔"

یہ کہہ کر جوَن کی لاش اٹھائی اور گنجِ شہیداں میں لا کر رکھ دی۔ بنی اسد کہتے ہیں کہ جب دفنِ شہدا کے وقت ہم جوَن کے سرہانے پہنچے تو چہرے سے نور کی شعاعیں نکل رہی تھیں اور جسم سے مشک و عنبر سے بہتر خوشبو آ رہی تھی۔

سوانح عمری سرکار عمدۃ العلماء

انتہائی دیدہ زیب، خوبصورت، بیشمار تصویریں، ہر تصویر فریم میں لگانے کے لائق۔ یہ بات اب یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ دنیائے شیعیت کے کسی عالم کے بھی سوانح حیات اتنے دیدہ زیب طریقے پر شایع نہیں ہوئے۔

قیمت لاگت سے بھی کم۔ صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

عمدۃ العلماء کلنڈر

شیعیانِ ہند کے رہبرِ اعظم، زینتِ محراب و منبر، سرکار عمدۃ العلما مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہ کی نایاب تصویر سے مزین کلنڈر۔

آفسٹ پر چھپے ہوئے اس کلنڈر کا تیسرا ایڈیشن بھی اب ختم کے قریب ہے۔ سائز ۲۲×۱۸، ۴ رنگ، آفسٹ پرنٹنگ، عربی اور انگریزی تاریخیں، انتہائی حسین، انتہائی خوبصورت۔

قیمت صرف ۴۰ نئے پیسے

ملنے ————— کا پتہ

مکتبۂ ایمان، جوہری محلہ۔ لکھنؤ ۳

مکتبۂ ایمان، جوہری محلہ، لکھنؤ ۳
کی

تمام کتابیں آپ حسب ذیل پتوں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں

احباب پبلشرز، اقبال منزل، مقبرۂ عالیہ، گولہ گنج۔ لکھنؤ

صدیق بک ڈپو	امین آباد۔ لکھنؤ
امامیہ مشن	نخاس۔ لکھنؤ
کتب خانہ	اکبری دروازہ چوک۔ لکھنؤ
صادق بک ڈپو	چوک۔ لکھنؤ
رزاقی بک ڈپو	چوک۔ لکھنؤ
مجاہد بک ڈپو	گلی شاہ چھڑا، وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ
جوبلی بک ڈپو	پریڈ۔ کانپور
شیعہ مسجد	ہملٹن اسٹریٹ۔ کشمیری گیٹ دہلی
علمدار بک ڈپو	بمبئی
حکیم سردار علی صاحب	پٹنہ سٹی
کتب خانہ حیدری	حیدرآباد دکن

مذہبی کتابیں

احباب لاکٹ تعویذی

یہ لاکٹ احباب پبلشرز نے
بلاک سے چھاپا ہے۔

ہدیہ ۱/۲۵

تحفۃ العوام

احباب پبلشرز نے یہ تحفۃ العوام
مع فوٹو کے شائع کی ہے جس میں
کچھ مزارات مقدسہ کے بلاک بھی ہیں
اور آغا محسن الحکیم کا بلاک بھی ہے۔
عمدہ کتابت اور طباعت
بہترین کاغذ۔

قیمت صرف -/۴

مجالس الشیعہ

مصنفہ
جناب مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ
جس میں اور مسودات بڑھا کر
بار دوم چھاپا گیا ہے۔
یہ حدیث کی کتاب بہت ہی اچھی
اور عام فہم ہے۔

قیمت -/۲

نور ایمان

مؤلفہ مولوی خیرات احمد صاحب
جس کے پچاسوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں

قیمت -/۵

احباب پبلشرز اقبال منزل مقبرہ عالیہ گولہ گنج۔ لکھنؤ

ذوالفقار یہ وہ مسدس ہے جسے شمیم کرہانی نے عزاخانہ کے امامباڑہ میں پڑھا اور پسند کیا گیا ۹۷ بند۔ یہ مسدس مع مقدمہ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کے۔ عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ اسے احباب پبلشرز پیش کر رہا ہے۔ قیمت -/۵۰

عقیدہ و عمل ———— بانو سید پوری

جس میں آپ کو حضرات چہاردہ معصومین علیہم السلام اور دیگر بزرگان دین کے متعلق معرکۃ آرا نظمیں یکجا نظر آئیں گی۔

۲۰۸ صفحات، سائز $\frac{20 \times 26}{16}$ مجلد قیمت -/۲

تاریخ ائمہ انبیائے کرام کے ضروری ومختصر اور ائمہ طاہرین کے مفصل حالات معتبر ترین کتب سے۔ یہ کتاب عرصہ سے شیعہ نصاب تعلیم مسلم یونیورسٹی میں داخل ہے۔ دوسرا ایڈیشن قیمت -/۵

مصنفہ: مولانا سید کرار حسین فخرالافاضل واعظ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

ہابیل قابیل کتاب "بھائی بھائی" مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا محققانہ جواب ہے، برق صاحب نے اس کتاب میں مذہب امامیہ کے خلاف جو زہر اگلا ہے کتاب "ہابیل قابیل" اس کا تریاق ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ تقریباً ۵۰۰ صفحات، عمدہ کتابت وطباعت۔ قیمت محض ۳/۵۰

ہمارا دعویٰ ہے کہ مذہبی کتابیں اتنی کم قیمت پر نہیں مل سکتیں صرف پانچسو جلدیں طبع ہوئی ہیں۔ پہلی فرصت میں طلب کیجئے۔